گئودان کا تنقیدی مُطالِعہ

ڈاکٹر سیّد احتشام احمد ندوی

گئودان کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

سلسلہ فیض المصنفین نمبر ۴

گئودان کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

ایم۔ اے (اردو) ایم۔ اے (عربی)، ایم۔ ٹی۔ ایچ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرالا

آٹھ روپیہ

مت

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب: گئودان کا تنقیدی مطالعہ مصنّف: ڈاکٹر احتشام احمد ندوی

ناشر: فیض المصنفین

کاتب: سیّد منظور محی الدین کلیانوی طبع اوّل: ۵۰۰

سالِ اشاعت: ۱۹۷۵ء قیمت مجلد دس روپے غیر مجلد آٹھ روپے۔

مصنّف کی دوسری کتابیں: - (۱) جدید عربی ادب کا ارتقاء - قیمت تین ۵۰/ روپے

(۲) عربی شاعری کے بنیادی رجحانات' قیمت تین ۵۰/ روپے

(۳) تنقید کے اُصول و نظریات قیمت مجلد سات روپے غیر مجلد چھ روپے

(۴) عربی تنقید کا ارتقاء (زیر طبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(۵) جدید عربی شاعری کا ارتقا (زیر طبع انجمن ترقی اردو)

ملنے کے پتے

(۱) ڈاکٹر مسعود الحسن قدوائی، کھولینڈی، ضلع رائے بریلی - یو - پی -

(۲) دانش محل بک سیلرز امین الدولہ پارک لکھنؤ - یو - پی -

(۳) مصنّف ریڈر و صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی - کالی کٹ کیرالا

مصنف کے بارے میں

وطن: - مخدوم پور پیر زادگان، ضلع سلطان پور، یو - پی -

تعلیم: - اسناد عالمیت و فضیلت ندوۃ العلماء لکھنؤ میٹرک تا بی اے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ایم اے، ایم - ٹی - ایچ، پی ایچ ڈی، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

مشغلہ: صدر شعبۂ عربی و فارسی کالی کٹ یونیورسٹی - کالی کٹ کیرالا

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر	عنوانات	سلسلہ نمبر
۵	گئودان پرستی اور گئودان شکنی (پروفیسر مسعود حسین خاں مدظلہ العالی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)	۱
۹	گئودان کی عظمت	۲
۲۵	گئودان ۔ ایک تنقید حیات	۳
۳۱	اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ترجمانی	۴
۳۵	ہندو مسلم اتحاد	۵
۳۹	ترقی پسندی	۶
۴۵	اشتراکیت	۷
۴۹	فسانۂ آزاد، امراؤجان اور گئودان	۸
۵۶	حقوقِ نسواں	۹
۶۴	ہندی ماحول اور تہذیب	۱۰
۶۸	اردو میں گئودان کی حیثیت	۱۱
۷۵	گئودان کی زبان	۱۲
۸۲	پریم چند کے اسلوب کا تدریجی ارتقار	۱۳
۹۱	پریم چند کی تشبیہات	۱۴

سلسلہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۵	مرقع نگاری	۹۵
۱۶	منظر نگاری	۱۰۰
۱۷	دیہاتی الفاظ	۱۰۸
۱۸	ہندی الفاظ	۱۱۴
۱۹	چند عیوب کی نشاندہی	۱۱۶
۲۰	ہوری	۱۲۲
۲۱	دھنیا	۱۳۳
۲۲	گوبردھن	۱۳۶
۲۳	داتا دین	۱۴۱
۲۴	نوکھے رام	۱۴۵
۲۵	جھنگری سنگھ	۱۴۸
۲۶	پروفیسر مہتا	۱۵۳
۲۷	مس مالتی	۱۶۱
۲۸	رائے پال سنگھ	۱۶۵
۲۹	مرزا خورشید	۱۶۹
۳۰	مسٹر کھنّا	۱۷۳
۳۱	اونکار ناتھ	۱۷۷
۳۲	کھنہ	۱۷۹
۳۳	پروفیسر مسعود حسین کا نظریہ گئودان تصنیف یا ترجمہ	۱۸۱

گئودان پرستی اور گئودان شکنی

جاوید منزل
جامعہ اردو روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محبی ڈاکٹر احتشام صاحب

تسلیم!

عنایت نامہ موصول ہوا۔ دلچسپ بات ہے کہ آپ گئودان پرستی کر رہے ہیں اور میں گئودان شکنی!

میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ یہ مسلم ہو جائے کہ اردو گئودان اصل تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے اور وہ بھی ایک اور صاحب کا کیا ہوا۔ تو گئودان کی تنقید کا انداز ہی بدل جائے گا۔

ہماری زبان کے مختلف شماروں میں گئودان پر مختصر نوٹس کی شکل میں میرے مضامین نکلے تھے۔ اب ان پر مبنی ایک بسیط مطالعہ فکر و نظر میں شائع ہوا ہے۔ ایک آف پرنٹ بھیج رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ گئودان پر (اپنی تالیف پر) مجھ سے مقدمہ لکھوانے کے بجائے میرے اس مضمون کو مقدمہ یا تتمہ کے طور پر شامل کر دیں تاکہ گئودان پر تنقید کے

تمام پہلو آجائیں۔ یوں بھی فکر و نظر محدود و مخصوص دائرہ رکھتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کو اس مضمون کا علم نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس مضمون کے بعد گئودان پر تنقید بحیثیت ترجمہ کے ہونی چاہیئے نہ کہ اصل تصنیف پر۔

آپ سے زیادہ میں آپ کے قلمی کارناموں سے واقف ہوں اور آپ جو بھی لکھتے ہیں شوق سے پڑھتا رہتا ہوں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ فقط۔

مسعود حسین

گئودان کی عظمت

گئودان ایک تاریخ، ایک تہذیب، ایک تصوّرِ حیات اور ایک دور کی ترجمان ہے۔ پریم چند اُردو کے افسانوی ادب پر ایک تناور درخت کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی عظمت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو میں ان کا املیاز و افتخار نمایاں ہے۔ انھوں نے پہلی بار اُردو کو عوامی زندگی سے تفصیل و تجزیہ کے ساتھ آشنا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر آزادی سے قبل تک ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام میں عوام، کسان اور مزدور کی حالت کا صحیح اندازہ گئودان کے صفحات سے ہو سکتا ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جو کسان کی دکھ بھری داستان کا ایک ایک پہلو نمایاں کرتا ہے۔ اس میں ہندوستانی کسان کی آزمائش، آرزوئیں، محنت و مشقت، خوشامد و بیگار، مایوسی و مجبوری اور زندگی کے سارے پہلو نمود ہستی سے اختتام ہستی تک آجاتے ہیں۔ یہ پہلا ناول ہے جس میں مصنف نے ہندوستان کے سب سے بڑے اور اہم مگر مجبور و مقہور طبقہ سے تعرض کیا ہے۔ ہندوستانی کسان صدیوں سے استحصال بالجبر کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اس کی محنت کی کمائی پر معاشرے کے دولت مند طبقہ نے ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ہے بلکہ اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔

کسان کی کھیتوں میں اَن تھک محنت اور خون پسینہ کی کمائی کو زر و زمین کی طاقت سے مہاجن، زمیندار، مذہبی پیشوا۔ برہمن، کارندے،

پولیس والے اور ادھار دینے والے طبقوں نے ہمیشہ غصب کیا ہے۔ ہندوستانی گاؤں میں جو شخص بھی صاحبِ اثر اور صاحبِ مال بن جاتا ہے وہ غریب کسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ اس ناول میں جتنے کردار ہیں وہ سب استحصال بالجبر کرنے والے طبقات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پریم چند نے ان ظالم طبقات کے خوں خوار عزائم کو طشت از بام کیا ہے۔ دیہاتی زندگی میں کسان ان کا شکار ہوتا ہے اور شہری زندگی میں مزدور ان کے پنجے میں پھنستا ہے۔ فن کار نے ان دونوں مظلوم طبقوں کو مصوّر کیا ہے یعنی کسان اور مزدور اول الذکر طبقہ کی تصویر مکمل و کامیاب ہے مگر مؤخر الذکر طبقہ کی ترجمانی ناقص و نامکمل ہے۔ میرے خیال سے پریم چند نے یہ بنیادی غلطی کی ہے کہ ناول کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک حصّہ شہری زندگی اور اس کے مسائل کا ترجمان ہے اور دوسرا حصّہ دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق ہے۔ ناول کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ ان دونوں حصّوں کے دو ناول آسانی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ناول کو حصّہ اول و حصّہ دوم میں تقسیم کر کے دو جلدوں میں کر دیا جائے۔ ایک حصّہ شہری زندگی پر مشتمل ہو اور مزدوروں کے مسائل پیش کرے اور دوسرا حصّہ دیہاتی زندگی پر مشتمل ہو اور کسانوں کی زندگی کی مشکلات سے تعرض کرے۔ چونکہ ہندوستانی شہر اور دیہات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کچھ ایسا ہی فرق پریم چند کے ناول کے ان حصّوں میں بھی نظر آتا ہے جو ان پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ مثلاً جو کشمکش حیات کی فلسفیانہ بحثیں مس مالتی، مسٹر کھنا اور پروفیسر مہتا میں ہوتی ہیں وہ ان مسائل سے قطعاً مختلف ہیں جو ہمارے سامنے ہوری کی زندگی

شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ گاؤں کے زمیندار رائے اگر پال سنگھ کے ذریعہ شہری اور دیہاتی زندگی میں ارتباط پیدا کیا گیا ہے مگر چونکہ پریم چند کا مخصوص موضوع ومطالعہ دیہاتی زندگی سے متعلق ہے اس لئے جو گہرائی وگیرائی دیہاتی زندگی کے بیان میں نظر آتی ہے۔ اس کا پتہ شہری زندگی میں نہیں چلتا۔

اگرچہ شہری کرداروں میں تفصیل کی کمی ہے مگر وہ دراصل شہری زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے ہیں جن سے وہ مستعار ہے۔ ان کے اندر وہ تمام نقائص نظر آتے ہیں جن سے شہری زندگی میں کشاکش اور کشمکش پیدا ہوتی ہے اس لئے روح کے لحاظ سے ناول میں شہری کردار بھی وہی رول ادا کرتے ہیں جو دیہاتی کردار ادا کرتے ہیں۔ دونوں زندگی کے ان عناصر کی ترجمانی کرتے ہیں جو عوام کا استحصال کرتے ہیں دونوں تصویروں میں ظالم و مظلوم کو پریم چند نے آمنے سامنے کر دیا ہے اور اپنے دور کے ہندوستانی سماج کی (خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی ہو) انھوں نے بالکل صحیح ترجمانی کی ہے اور اس حیثیت سے ناول نہایت کامیاب ہے۔ کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے مس مالتی اور مسٹر مہتا کے کردار ابھرتے ہیں، مگر فلسفیانہ ہونے کے باعث ان کے اندر زندگی کے حقائق کی رونق نظر نہیں آتی جو دیہاتی کرداروں کا اصل سرمایہ ہے۔

پریم چند کو شہری زندگی کی ترجمانی کا سلیقہ ہے مگر اس حصہ کا نقص اس کا اختصار ہے جس میں ایک تصویر بھی ہوری، دھنیا اور گوبردھن کی طرح مکمل نہیں۔ پریم چند نے شہری زندگی کا مطالعہ بمبئی کے ایک سالہ قیام میں کیا تھا مگر حق یہ ہے کہ وہ مشاہدہ اختصار کے باعث پوری طرح سامنے نہ آسکا۔ شہری زندگی کے کرداروں میں پورے ایک ناول کا مسالہ موجود ہے

مگر مختصر ہونے کے باعث کما حقہ ایک کردار بھی پوری طرح ابھر نہ سکا۔ مرزا خورشید، مسٹر کھنا، مسٹر ٹنخا، مس مالتی، مسز کھنا، اونکار ناتھ اور پروفیسر مہتا یہ تمام کردار زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں اور شہری زندگی کے ان تمام مسائل کو پیش کرتے ہیں جن سے زندگی میں کشمکش و کشاکش محسوس ہوتی ہے۔ اس کا ایک نقشہ یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

مرزا خورشید : مزدوروں کے لیڈر ہیں۔

اونکار ناتھ : اخبار نکالتے ہیں۔

مسٹر کھنا : شکر مل کے مالک۔

مسٹر ٹنخا : وکیل، دھوکے باز، دلال اور ابن الوقت ہیں۔

مس مالتی : نیک سرشت لیڈی ڈاکٹر ہیں۔

مسٹر مہتا : کالج میں پروفیسر ہیں۔

شہری زندگی میں جو منافقانہ اور غیر مخلصانہ ماحول ہے۔ اس کی تصویر پریم چند نے کامیابی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کئی مواقع پر شہری زندگی کے دورُخے پن کو نمایاں کیا ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اونکار ناتھ : کانگریسی ہیں مگر بدیسی مال کا اشتہار دیتے ہیں۔ کسانوں کے علمبردار ہیں ——— مگر رائے صاحب سے رشوت لیکر کسانوں پر ظلم کو چھپاتے ہیں۔

مرزا خورشید : عوام کے رہنما ہیں مگر عیاشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شراب میں پیسے لٹاتے ہیں۔ دولت مند طبقہ کی طرف للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

رائے صاحب : کانگریس میں بھی شریک ہیں مگر انگریز حکام کی دعوتیں کرتے ہیں اور ان کو خوش رکھتے ہیں۔

مس مالتی: پروفیسر مہتا سے ملتی ہیں اور مسٹر کھنا سے بھی حتیٰ کہ گوبندی کو شبہ ہوتا ہے کہ مالتی نے کھنا پر قبضہ کر لیا ہے۔

مسٹر کھنا: کانگریس کے لیڈر ہیں دو بار جیل جا چکے ہیں۔ مگر مزدوروں کا خون چوسنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ چھوٹے باٹوں سے تول کر کسانوں سے بھاؤ سے زیادہ ایکھ لیتے ہیں۔ مزدوروں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں مگر تیاگ اور سیوا کی بات بھی کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت عیش پسند ہے۔

پروفیسر مہتا: مس مالتی سے عشق کرتے ہیں مگر دل بہلانے کیلئے شادی نہیں کرنا چاہتے اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے سے قریبی تعلق پیدا کرے۔

تنکھا: سراپا منافقت ہیں دو آدمیوں کو الکشن میں کھڑا کر کے دونوں سے پیسے وصول کرتے ہیں مختلف دھوکے کے کاروبار کرتے ہیں۔ شہری زندگی کے گناہوں اور مکاریوں کا مجسّمہ ہیں۔

چونکہ یہ کردار اصل دیہاتی کرداروں سے لگا نہیں کھاتے اس لیئے اگر یہ نہ بھی ہوتے تب بھی ناول کی اہمیت اسی طرح مسلم ہوتی جیسا کہ آج ہے۔

پریم چند نے اپنے ہر کردار سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے دور کا فرسودہ سماجی نظام مردہ ہو چکا ہے جس میں عفونت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ انگریزی حکومت نے جاگیردارانہ نظام کی جکڑ بندیوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان کو اور مضبوط تر کر دیا جس کے نتیجہ میں غریب و بے بس عوام کی زندگیاں مقید پرندوں سے بھی بدتر ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دور میں پریم چند نے یہ ناول لکھا ہے۔ اس میں تحریک آزادی عوام تک پھیل چکی تھی۔ حکومت ظلم و تشدد سے کام لے کر قوم کی اعصابی

قوت کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ دوسری جانب زمیندار و سرمایہ دار دو عملی کر رہے تھے۔ وہ ایک جانب قومی تحریک آزادی میں شریک تھے مگر دوسری جانب حکومتِ وقت سے وفاداری بھی جتاتے تھے اور اس کی مرضی پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق

بوالہوس ہر گز نہ داند جام و سنداں باختن

پریم چند نے دیہاتی اور شہری دونوں زندگیوں میں جو منافقت، نفس پرستی، خود غرضی اور دو رخا پن ہے اس کو پوری طرح نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے بنیادی طور پر تین سماجی پہلوؤں کو پوری طرح تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۔ شہری و دیہاتی زندگی میں جنسی بے راہ روی اور ناجائز تعلقات۔

۲۔ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ناانصافی اور ان تمام طبقات کا بیان جو اس خون آشام ڈرامے میں حصّہ لے رہے تھے۔

۳۔ انسانی نفسیات، معاملات اور کردار میں جو منافقت اور دو عملی ہے اس کی مکمل تصویر سماج کے آئینہ میں پریم چند نے پیش کی ہے۔

اس ناول کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زندگی کو صرف دو طبقوں میں تقسیم کر دیا اور بتایا کہ اس دنیا میں نہ کوئی ذات ہے اور نہ مذہب، دراصل کشمکش معاشی ہے امیر اور غریب یہاں دو ہی ذاتیں ہیں۔ ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم۔ یہ تقسیم خاص طور سے ہوری کی زندگی میں واضح ہے۔ جہاں ہر طرف استحصال بالجبر کرنے والے طبقات سامنے آتے ہیں۔ اگر پریم چند ناول اسی طرح لکھتے کہ دو طبقات نمایاں ہو کر سامنے

آجاتے تو اچھا تھا مگر ان کی ایک نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی شکل ہے۔ وہ آزاد بننے کی کوشش کرتے ہیں مگر پوری عمر کا بندھن ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ کبھی غیر مذہبی روپ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہوتے اور پورے ناول کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

گئودان پریم چند کا آخری ناول ہے جو ۳۶-۱۹۳۵ء میں لکھا گیا۔ اس کو اردو میں مکتبہ جامعہ نے ان کے انتقال کے ایک سال بعد شائع کیا۔ یہ ناول ۵۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۳۶ ابواب ہیں۔ بقول محترم پروفیسر مسعود حسین خاں، پریم چند نے اس کو خود اردو میں منتقل نہیں کیا۔ انھوں نے اس کو ہندی میں لکھا تھا پھر اپنے ایک دوست اقبال سحر ورما سے اپنی زندگی میں اردو میں ترجمہ کروایا تھا اور اس پر نظر ثانی کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زبان پریم چند کی زبان نہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق صحیح ہے۔ مگر میری رائے تو یہ ہے کہ جس آخری دور میں پریم چند نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں ان کا ہندی اور اردو اسلوب بہت کچھ ایک دوسرے سے قریب آگیا تھا اور فرق محض مشکل الفاظ کا رہ گیا تھا۔ اس لئے گئودان اور گودان کے فلسفیانہ اور ادبی حصے ضرور الگ ہیں مگر باقی حصوں میں بڑی قربت ہے۔

اس ناول کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ بیلاری گاؤں میں ایک کسان ہوری رہتا ہے۔ اس گاؤں کے اشخاص کا تعلق مختلف حیثیت سے ہوری سے رہتا ہے اور اس کی زندگی کے واقعات ہی اس ناول کی کہانی ہیں۔ اس کی عورت کا نام دھنیا ہے جو تیز زبان مگر نہایت وفادار و سلیقہ مند عورت ہے۔

ہوری کا لڑکا گوبر ہے جو لکھنؤ جا کر وہاں کی زندگی میں رنگ جاتا ہے۔ بگڑ جاتا ہے۔ تاڑی پیتا ہے مگر جب اسٹرائک میں پیٹا جاتا ہے تو اسکو ہوش آتا ہے۔ گوبر ایک لڑکی جھنیا سے عشق کرتا ہے اور غیر قانونی طور پر اپنے یہاں رکھ لیتا ہے۔ جس پر برادری ہوری سے تاوان طلب کرتی ہے۔ ہوری کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے دروازہ پر ایک گائے بندھی ہوئی دیکھے۔ وہ بھولا اہیر سے اسکو شادی کا لالچ دلا کر ایک گائے لیتا ہے مگر اس کا بھائی ہیرا گائے کو حسد کے باعث زہر دے دیتا ہے۔ جو کچھ وہ کماتا ہے اپنی تین چار بیگھے کی کھیتی میں محنت سے پیدا کرتا ہے۔ اس کو ساہوکار، زمیندار اور مذہبی ٹھیکیدار مختلف بہانوں سے اپنا بنا لیتے ہیں۔ آخر میں جب اسکی زمین رہن ہو جاتی ہے تو وہ دوسروں کی مزدوری کرتا ہے۔ ہوری کی دو بیٹیاں ہیں ایک سونا دوسری روپا۔ سونا کی شادی تو ڈھنگ سے ہوتی ہے مگر روپا کو مفلسی کے باعث دو سو روپیہ کے لالچ میں وہ ایک چالیس برس کے ادھیڑ عمر کے آدمی سے بیاہ دیتا ہے۔ اس کا لڑکا گوبر اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس مفلسی میں وہ ایک دن مزدوری کرنے جاتا ہے۔ اس کو لو لگ جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے

یہ ہے مختصر کہانی اس ناول کی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی میں خود شہری زندگی اور کرداروں کی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال اس بارے میں تفصیل سے بحث بعد میں آئیگی۔ مصنف نے ہندوستانی کسانوں، مزدوروں، سرمایہ داروں، تعلیم یافتہ خواتین، زمیندار اور ان کے مسائل، اڈیٹر اور اس کی مشکلات، ہندوستانی گاؤں کے سرغنے، زمیندار کارندے، ساہوکار، برہمن اور پولیس والے غرض زندگی کے اہم اور بنیادی امور و مسائل کو پریم چند نے اس ناول میں پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اسکی

عظمت کا راز ایک غریب کسان کی زندگی کی نفسیات کی گتھیوں میں ہے۔ پریم چند یہاں ایک دانائے راز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ہندوستانی معاشرے کے عیوب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ برہمن اور سرمایہ داروں کی غربت کے ساتھ کشمکش کی تصویریں حقائق کا مرقع بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔

گئو دان کا موضوع نہایت اعلیٰ ہے۔ پریم چند اس کے ذریعہ اس زندگی سے ناآسودگی کا اظہار کرتے ہیں جو ہوری کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی۔ پریم چند کا تخیل انسانی ہمدردی کے محور پر گھومتا ہے جو ایک مخصوص انداز، تہذیب اور زبان میں ظاہر ہوتی ہے۔ ناول میں ناآسودہ ماحول اور مضطرب دلوں کی تصویر کشی ہے۔ گئو دان درحقیقت پریم چند کے شعور کے ارتقاء اور ادراک حقیقت کے واضح نشانات کا غماز ہے موضوع کی وسعت، دلکشی، قوت اور جزئیات نگاری میں یہ ناول ممتاز ہے فکر و فن کے جلوے پورے ناول میں اس طرح بکھرے ہیں جیسے آسمان پر ستارے۔ اس سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند کی ہندو تہذیب سے واقفیت اور اس کو فن کے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت درجۂ کمال تک پہونچ چکی تھی۔

پریم چند کا شعور جاگ اٹھا تھا مگر حق یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح خطوط مقصد کے بارے میں نہ تھے انھوں نے کسان کو کبھی کامیاب ہوتے نہیں دکھایا۔ دیہاتی زندگی میں بہترین کردار ہوری کا ہے۔ شہری زندگی میں سب سے دلکش کردار پروفیسر مہتا کا ہے مگر جتنی جاندار تصویر کشی دیہاتی کرداروں میں ہوری کی ملتی ہے۔ اتنی جاندار اور

حقیقت پسندانہ تصویر پروفیسر مہتا کی نہیں ہے۔

اِس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ گئودان میں پریم چند کی پوری عمر کی مہارت، مشاہدات، تجربات اور غور و فکر کا نچوڑ مصور ہو کر سامنے آگیا ہے۔ انھوں نے گہرائی کے ساتھ فرد اور سماج دونوں کے اصلاح کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے سیاسی اور سماجی پیچیدگیوں سے تعرض کیا ہے ان کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ سرمایہ دار طبقے کو پوری طرح نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ طبقہ ایک طرف کانگرس کی مالی مدد کرتا ہے، دوسری طرف حکومت کو خوش کرتا ہے اور تیسری جانب کسان سے استحصال بالجبر کرتا ہے۔ شہری زندگی میں معاشی لوٹ کھسوٹ کا اندازہ انھیں بمبئی کے ایک سالہ قیام کے دوران ہوا جب کہ وہاں انھوں نے ایک فلم غریب مزدور بنائی جس کو حکومت کی نظر کھا گئی اور اس نے اس کو سنسر کر لیا۔ یہی کشمکش ہے امیر و غریب کے درمیان جس کی ترجمانی پریم چند بڑے جاندار کرداروں کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پریم چند کی ادبیات میں یہ کتاب حقیقت اور صناعی کے لحاظ سے درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اِس میں وہ فکر و شعور کے میدان میں بلاشبہ آگے بڑھے ہیں۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کے مسائل، مشکلات امیدیں، مایوسیاں اور آرزوئیں اس طرح مصور کر دی ہیں کہ ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ پوری کتاب ہوری کے گرد گھومتی ہے اور اس غریب کسان کی آزمائشیں، مجبوریاں اور بیکسی کے نقشے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ نگاہ حقائق کی تجلی سے روشن و شاد ہو جاتی ہے۔

گئودان میں پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مجبور و افلاس زدہ طبقہ میں سے ہیرو کا انتخاب کیا اور ہوری جیسے معمولی کسان کو ناول کا ہیرو بنا کر انھوں نے درحقیقت ادب کو عوام سے قریب تر کر دیا انھوں نے ادب میں اس لحاظ سے ایک نئی روایت ایک جاندار اقدام اور دلکش نمونہ پیش کیا ہے اور ادب و زندگی کے رشتہ کو مضبوط تر کر دیا ہے۔

علی عباس حسینی اپنی کتاب ناول کی تاریخ و تنقید میں لکھتے ہیں کہ ہوری کا کردار ابدی حقیقت نہیں رکھتا اسلئے کہ وہ ماحول، نظام حکومت اور زمینداری سب ختم ہو چکے۔ اس لئے اس کی حیثیت و اہمیت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ میں اس نظریہ کا اسلئے مخالف ہوں کہ یہ تصور نہایت سطحی ہے۔ اعلیٰ ادبی تخلیقات ابدی زندگی لیکر آتی ہیں۔ حالات کی تبدیلی کا ان پر اثر نہیں پڑتا۔ گوئٹے کے پاس ایک تاجر صاحب یہ کہتے آئے تھے کہ آپ نے فلاں کتاب میں فلاں تاریخی نام غلط لکھا ہے۔ گوئٹے نے ان کی بات سن لی اور کوئی توجہ نہیں کی۔ اس لئے کہ نام، حکومت، نظام اور اشخاص یہ سب مطلوب نہیں ہیں۔ اصل روح وہ بنیادی ترجمانی ہے جو انسانی معاشرہ سے متعلق ہوتی ہے۔ انسان چاہے جس دور کا ہو اس کی کہانی ہماری دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ آدمی بجائے خود ایک محشر خیال بھی ہے اور محشر عمل بھی۔ اس کا مطالعہ خصوصاً جبکہ حقائق کے آجانے میں ہو تو ہمارے جذبات و تصورات کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پریم چند نے ایک دور ایک سماج اور ایک نظام حکومت میں کسان کی زندگی کا نقشہ ہوری کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ جاگیردارانہ نظام کسانوں اور نچلے طبقہ کیلئے زہر ہلاہل تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف زمیندار کی خدمت تھا ان کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ہوری کہتا ہے کہ ہمارا جنم اس لئے ہوا ہے کہ ہم بڑوں کی خدمت کریں اور محنت کرکے ان کا گھر پاٹ دیں۔ دھنیا بار بار کہتی ہے کہ یہ پیسے والے ہم غریبوں کا پیٹ کاٹتے ہیں اور ہمارے بچوں کا رزق چھین لینا چاہتے ہیں۔ پریم چند نے امیر اور غریب، کسان اور زمیندار، کسان اور مہاجن، کسان اور پولیس، کسان اور کارندے اور ضلع دار کے تعلقات کی نوعیت ہوری کے کردار میں پوری طرح مصور کردی ہے۔ یہ استحصال آج بھی جاری ہے فرق صرف طریقوں کا ہے۔ پہلے زمینداری تھی۔ اب صنعت کاری اور سرمایہ داری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بغیر اس دور اور اس میں کسان کے مسائل اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم و بیکسی کی اس داستان کا صحیح تصور محال ہے جو پریم چند نے پیش کی ہے۔ گئودان کو اس کے دور سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مگر یہ کوئی عیب نہیں بلکہ عظمت ہے اسلئے کہ ہر دور کے ادب کو اس زمانہ کے رجحانات کے آئینہ میں دیکھنا ہی صحیح انداز فکر ہے۔ کسان کی حالت آج بھی اچھی نہیں۔ اب بھی سرمایہ دار اور مہاجن اس کا خون چوستے ہیں۔ اکثر گاؤں میں ایک ہی دو آدمی صاحب حیثیت اور متمول ہوتے ہیں۔ باقی لوگ اس کے آرام و آسائش میں مددگار ہوتے ہیں در اصل ہوری اپنے طبقہ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے جو ہمیشہ باقی رہے گا۔ تفصیلات کا اختلاف اس لئے اہمیت نہیں رکھتا کہ ہر دور انسانی تاریخ کا

جزو ہے اور کل میں کسی جز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اندر ناتھ مدن "پریم چند۔ ایک دو بچن میں" لکھتے ہیں کہ "پریم چند کے فن کی اصل غایت نہ تو کردار نگاری ہے۔ اور نہ ہی پلاٹ ہے بلکہ سدھار ہے۔ مقصد اور سماجی مسائل کی وضاحت ان کے ناولوں میں پہلی بات ہے کردار ان مسائل کو نمایاں کرنے اور موثر بنانے کیلئے آتے ہیں"۔ گئو دان در حقیقت سماجی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اس میں انسانیت دوستی کا خزانہ مضمر ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے اس کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ پریم چند ہی کا کام تھا کہ انھوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا اور اس دنیا کی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جاندار، سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی مظہر تھی۔ پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم بڑھایا"۔ یہ واقعہ ہے کہ پریم چند کے آخری ناولوں میں انسانوں کے ساتھ سماجی نظام کی بے انصافیوں سے ان کو اذیت کا شدید احساس ہوتا تھا ؎۱ اس لئے ان کی انسان دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ کشن پرشاد کول نے گئو دان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "میری نظر سے ابتک کوئی دوسرا ناول اس پایہ کا اردو میں نہیں گذرا۔ یقیناً اسے پریم چند کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ صاف ستھرا آئینہ جس میں دیہاتی زندگی کی سب ہی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اردو زبان و ادب میں دوسرا نہیں"۔

پورا ناول ظالموں اور مظلوموں کی داستان ہے۔ دیہاتی اور شہری

؎۱ بحوالہ ڈاکٹر قمر رئیس "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ"۔

دونوں زندگیوں میں مختلف طبقات کسانوں مزدوروں اور محنت کش طبقوں کا خون چوستے ہیں۔ اس کا نقشہ گئودان کے آئینہ میں اس طرح تیار کیا جا سکتا ہے:۔

نوکھے رام	مس مالتی	لالہ پٹیشوری	مسٹر تنکھا
جھنگری سنگھ	مرزا خورشید	پنڈت داتا دین	مسٹر کھنہ
منگرو شاہ	پنڈت اونکارناتھ	رائے اگر پال سنگھ	پروفیسر مہتا

یہ سارے طبقات پیسے والے ہیں مس مالتی اور مہتا خیالات کے لحاظ سے بہتر ہیں مگر ان کی زندگیاں عیش پسندانہ ہیں۔ یہ کار پر چلتے ہیں اور انھیں عوامی زندگی سے کوئی سروکار نہیں تنکھا اور کھنہ تو واقعی خون چوستے ہیں۔

شہری زندگی میں مزدوروں کی محنت کا استحصال کرنے والے طبقات کا بیان بھی موثر ہے۔ کھنہ کی مل پریم چند نے جلا دی۔ اسلئے کہ انھوں نے مزدوروں کی مزدوری میں کمی اور کسانوں کو دھوکہ دے کر زیادہ ایکھ لی۔ چھوٹے باٹ استعمال کئے اور پیسے کم دیئے۔ تنکھا بھی خون چوس اور دھوکہ باز ہیں۔ دیہاتی زندگی میں نوکھے نہایت عیار ہیں جو رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ جھنگری سنگھ، لالہ پٹیشوری پنڈت داتا دین اور رائے اگر پال سنگھ سب مختلف طریقوں سے ہوری کی معاشی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہوری صرف ایک فرد ہے ورنہ گاؤں کے تمام غریب کسانوں کا یہی عالم تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دیہاتی زندگی میں جنسی تعلقات کی بے راہ روی پر بھی پریم چند نے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے گاؤں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ میں انھوں نے ایک بات چھوڑ دی۔ اکثر زمیندار

کسانوں اور اپنی رعایا کی عورتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور اس طرح کا استحصال بالجبر جاگیر دارانہ ماحول میں عام تھا۔ بیچارے کسان اس ظلم و جبر کے خلاف آواز بھی نہ اُٹھا سکتے تھے۔ پریم چند نے اس بہت اہم اور عظیم ظلم کی ترجمانی پورے ناول میں کہیں نہیں کی۔ یہ جنسی ظلم چھوٹے بڑے تمام زمیندار روا رکھتے تھے۔ یہ معاملہ راجے مہاراجے اور نوابوں کے یہاں منظم انداز میں تھا۔ مگر جہاں زمینداری تھی وہاں یہ ظلم و زبردستی بھی تھی۔ گئودان میں رائے صاحب زمیندار ہوتے ہوئے بھی جنسی زندگی میں بالکل پاک صاف نظر آتے ہیں۔ پریم چند جس دور کی ترجمانی کر رہے ہیں اُس کے لحاظ سے یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اب جنسی بے راہ روی کا ایک نقشہ ملاحظہ فرمایئے جو پریم چند نے گئودان میں پیش کیا ہے:۔

لالہ پٹیشوری کا تعلق	کہارن سے۔
نوکھے رام کا تعلق	نہری اہیرن سے۔
ماتا دین کا تعلق	سلیا چمارن سے۔
ہوری کا تعلق	دلاری سٹھانی سے۔
گوبردھن کا تعلق	جھنیا اہیرن سے۔

یہ واقعات حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پریم چند نے زندگی کے اس پہلو کی ترجمانی کی ہے۔ مگر اس میں زمینداروں کو نظر انداز کر کے انھوں نے ایک ناقص تصور پیش کیا ہے۔ اس لیئے کہ مذکورہ تعلقات میں فریقین کی رضا و رغبت شامل ہے مگر زمیندار کے یہاں

ظلم و زبردستی سے معاملات ہوتے تھے۔

پریم چند نے صرف دگ بجے سنگھ کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ نچلے طبقہ کی بہو بیٹیوں کو تاکتا تھا۔ اس سے ظلم عظیم کا نقشہ ذہن میں نہیں آسکتا جو زمیندار اپنی رعایا کی عورتوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ ان کے کارندوں کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ خوبصورت لڑکیوں کی نشان دہی کریں بڑے راجا۔ منشی کا انتخاب اس کی قابلیت کی بناء پر نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس صلاحیت پر کرتے تھے کہ وہ کتنی زیادہ حسین لڑکیاں فراہم کرنے پر قادر ہے۔ پورا زمیندارانہ نظام فارغ البالی، عیاشی اور جنسی و معاشی استحصال کا مصدر تھا۔

گئودان - ایک تنقید حیات

پریم چند گئودان میں ادب کو زندگی کی تنقید اور تصویر بنا کر پیش کرتے ہیں، وہ حقائق اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ ایک طرف ہندوستانی کسان کی سماجی و معاشی قدریں نمایاں ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف وہ اس امر کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان حقائق سے زندگی و سماج کو ان قدروں تک لیجائیں جن کو وہ بلندی اور عظمتِ حیات کا حامل سمجھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر سماجی اصلاح اور آزادی تھا۔ جس میں ان کے دور کے ہندوستان کی سیاسی تحریکات، سماجی بیداری اور معاشی تصورات دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں سماجی حقائق کی تلخیاں، مذہبی اجارہ داری کے بندھن، معاشی استحصال کے عناصر، ذات پات کے جھگڑے، مزدوروں کے مصائب اور کسانوں کے مسائل کی کشمکش کا مطالعہ وہ شہر میں کم مگر گاؤں میں زیادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کیلئے ایک گاؤں بیلاری کا انتخاب کیا ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہندوستانی سماج کا آئینہ بن کر آتا ہے۔ جس میں کسانوں کے درد و دکھ، مشکلات و مصائب، زندگی کی تلخیاں اور سماجی بندھنوں کی داستان تفصیل و تجزیئے کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مصنف اس چھوٹی سی محدود دنیا میں اصل ہندوستان کی تصویر پوری حقیقت نگاری، انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ، امیر و غریب طبقے کے اندازِ فکر اور معاشی و سماجی

مشکلات کا ایسا مرقع پیش کرتا ہے جس سے اردو ادب عاری تھا۔ وہ بقول پروفیسر آل احمد سرور "ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے۔ وہ یہیں کے مال سے اپنی دوکان سجاتے ہیں"[1]۔ اِن کی عظمت کا راز اس طبقہ کی ترجمانی میں پوشیدہ ہے جو دیہاتوں میں رہتا ہے اور اصل ہندوستانی سماج کی تصویر پیش کرتا ہے۔ درحقیقت اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ اسی کیفیت کے باعث بقول ڈاکٹر قمر رئیس "ان کے فن کے ہر گوشہ پر زندگی کے حقائق کی مہر ثبت ہے"[2]۔ انھوں نے پہلی بار کروڑوں کسانوں کی زندگیوں اُن کی مسرتوں، اُن کے غموں اور ان پر سماج کے سرمایہ دار طبقوں کے مظالم اور ان کے معاشی استحصال کی تصویروں سے اردو ادب کو آشنا کیا اور گئودان کے ذریعہ زندگی کے نورِ حقیقت سے اس کو روشن و تابناک بنا دیا۔ مہذب طبقات کی ترجمانی سے اردو ادب پٹا پڑا ہے۔ داستانوں میں طبقۂ امراء کے ٹھاٹھ دیکھیے۔ روپیوں کی فیاضی، سخاوت کے دریا، محلوں کی آرائش اور ان میں امیروں کی عشق بازیوں کے پُرتصنع مناظر سے باغ و بہار اور فسانۂ عجائب ہی نہیں۔ سرشار اور شرر کے ناول تک بھرے پڑے ہیں مگر ماتا دین گوبر، سلیا اور جھنیا کے عشق سے کون واقف تھا، دیہاتی زندگی کی اس انسانی فطرت کو پریم چند نے نئی تقاضوں کے ساتھ واضح کیا اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی "پریم چند نے حسن و عشق کو محل سراؤں اور مشاعروں سے نکال کر گاؤں کی چوپال اور جھپڑوں تک پہونچایا۔ ہمارے شعراء کی پوری نسل جو کچھ غزل اور مثنوی میں

---

[1] تنقیدی اشارے مصنفہ پروفیسر آل احمد سرور ۱۹۵۵ء ص ۲۱-۲۲

[2] پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار از ڈاکٹر قمر رئیس ص ۶۷

نہیں کہہ پائی تھی اسے تنہا پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زیادہ سچائی اور تاثیر کے ساتھ گاؤں اور گھورے پر سُنایا اور دکھایا[1] اِس ہندوستانی سماج، معاشی کشمکش، مذہبی اجارہ داریاں اور دیہاتی زندگی میں طبقاتی کشمکش اور کسانوں کے مسائل سے اردو ناول محروم تھا۔ پریم چند نے بڑی ژرف نگاہی سے زندگی کے سب سے دلکش اور اہم طبقہ کو اردو ادب میں روشناس کردیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں کہ " پریم چند کے کردار ہمارے طبقاتی نظام کے سب سے نچلے طبقہ سے آتے ہیں اور وہ ہر داستاں کا تاج کسانوں کے سر پر رکھتے ہیں اس عام انسان کے سر پر رکھتے ہیں جس کی کہانیاں ہمارے ادب کے لیئے ابھی تک اجنبی تھیں[2]"۔

پریم چند نے زندگی کے حقائق کو مزدوروں، کسانوں، دیہاتیوں اور نچلے طبقے سے اس طرح اخذ کیے ہیں کہ ان کی تصانیف میں اصل ہندوستان مصوّر ہو گیا ہے۔ "پریم چند زندگی اور خصوصًا دیہاتی زندگی کے مختلف مسائل کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ ان کو خوب، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں[3]" دیہاتی زندگی کی پیچیدگیوں، شہری زندگی کے مسائل اور مختلف سماجی عوامل سے پریم چند بڑی کامیابی سے گنو دان میں نپٹتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصدی انداز کو فن کے قالب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی مقصد ان پر تھوپا گیا بلکہ مقصد از خود کہانی سے، کرداروں سے اور مکالموں سے ابھرتا ہے،

۱؎ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، مقدمہ از رشید احمد صدیقی ص م

۲؎ ادبی تنقید از ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۴۳ ۳؎ ادیب علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۲ء مقالہ پریم چند پر ایک نظر از شکیل محمد فاروقی ص ۲۶

روح و نفس کو توانائی عطا کرتا ہے اور بلند قدروں سے آشنا بناتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ" وہ زندگی کی بھول بھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے بلکہ اس میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"[1]

پریم چند نے اس ناول میں کئی مواقع پر کانگریس کا ذکر کیا ہے۔ رائے صاحب اونکار ناتھ اور دوسرے سرکردہ اصحاب کانگریس میں شریک ہو کر جیل جا چکے ہیں۔ وہ کانگریس کی ملی مدد بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے شنکھا کے بارے میں لکھا کہ جب کانگریس کا زور تھا تو وہ کانگریس کیلئے سرگرم عمل نظر آتے تھے۔ جب ہندو مہاسبھا کی سرگرمیاں بڑھیں تو اس کیلئے کام کرنے لگے۔ غرض ناول میں وہ اس کیفیت کا کہیں کہیں ذکر کرتے ہیں جو ملک کی سیاسی فضا پر طاری تھی البتہ گئودان پر سیاسی و قومی تحریکات کا ذکر زیادہ نہیں مگر حسب موقع وہ اس اہم مقصد کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مسز مالتی شہر کانگریس کی صدر چنی گئی تھی۔ پریم چند ایک اہم اور عظیم مقصد کے ساتھ ادب کے میدان میں داخل ہوئے۔ سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی آزادی کو بھی اپنا مقصد اور آرزو قرار دیتے ہیں ایک خط میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت و شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں، ہاں ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند تصانیف چھوڑ جاؤں

---

[1] تنقیدی اشارے ۱۹۵۵ء ص ۲۲ - ۲۳

لیکن ان کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہی ہو۔[۱]"

بلاشبہ گئودان ان کی بلند تصانیف میں ایک عظیم تصنیف ہے جس میں قومی اور سیاسی مقاصد فنی انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں کرداروں کی قومی مفاد سے منافقت کا ذکر بھی ملتا ہے مگر یہ سب کچھ اس فنکارانہ اور دانشمندانہ انداز سے سامنے آتا ہے کہ کتاب پروپگنڈہ کی سطحیت اور سیاست کی عفونت سے پاک ہے صرف قومی عظمت کی لطافت اور قدروں کی بلندی سے ذوق کو بلندی اور روح کو تسکین عطا ہوتی ہے۔" پریم چند پر سیاسی تحریکوں کا زبردست اثر تھا وہ ملک کی سیاسی تحریکوں سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ سرکاری ملازمت بھی ترک کردی تھی اسی طرح غیر ملکی تحریکوں کا اثر بھی ان کی تحریروں میں خاص طور سے ملتا ہے[۲]۔ "گئودان میں نہ تو سیاسی واقعات وضاحت سے ہیں اور نہ قومی جدوجہد کا بیان البتہ مصنف نے صرف کرداروں پر کانگریس کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کانگریسیوں کے عیوب کی نشان دہی بھی کی ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ بعض حضرات ایک طرف کانگریس میں شریک ہیں مگر دوسری طرف انگریزوں کی خوشنودی بھی چاہتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعہ ملک کی جدوجہدِ آزادی میں زبردست حصہ لیا۔ انھوں نے "میدانِ عمل" کو گویا پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح عمری ہی بنا دیا ہے۔ وہ اپنے پندرہ سالہ ملازمت کے استعفیٰ میں لکھتے ہیں۔

"ان حالات پر نظر کرکے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا بھی حق حاصل ہے چونکہ

۱؎ خط بنام پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ مورخہ ۳ رجون ۱۹۳۰ء بحوالہ ماہنامہ سب رس اکتوبر ۱۹۷۱ء ص ۲۹ ۲؎ ماہنامہ سب رس اکتوبر ۱۹۷۱ء ص ۲۷

گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے لہذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا تاخیر مزید اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے[۱]۔ تحریک آزادی سے اسی خلوص کے باعث وہ ان لوگوں پر مختلف کرداروں کے ضمن میں تنقید کرتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے باعث کانگرس اور ملک کی آزادی کے ساتھ اخلاص کا برتاؤ نہیں کرتے۔ مصنف نے شہری اداروں میں اس طرز عمل کی نشان دہی از راہ خلوص کی ہے۔ خود انھوں نے تحریک آزادی کیلئے اپنی ملازمت ترک کردی وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اس راہ میں اخلاص سے کام لیں۔ وہ جس امر کی گئودان میں فن کے نازک پردوں میں تلقین کرتے ہیں وہ خود ان کا عمل بھی ہے۔ اس ناول میں تحریک آزادی کا ذکر بڑے عمدہ انداز سے مناسب مواقع پر آیا ہے بدیسی مال کے بائیکاٹ اور اس رقم کا تذکرہ بھی ہے جو صاحب مال کانگرس کو عطا کرتے تھے ۔ گئودان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کی نیرنگیاں اپنے شباب پر نظر آتی ہیں۔ اس میں شہری سرمایہ دار اور دیہاتی مہاجن کی تصویریں ہیں اس میں شہری عشق اور دیہاتی عشق کے مناظر ہیں۔ اسی میں تحریک آزادی کا بیان ہے۔ اس میں کانگرس کی جدوجہد کا ذکر جمیل ہے مگر حسین اشاروں میں اس انسانی نفسیات کی دلچسپ تصویریں ہیں، حسن و عشق، ذاتی مفاد، قومی خلوص، الکشن اور سماجی امور نیز مذہبی احساسات و جذبات بڑے دلکش انداز سے سامنے آتے ہیں۔ ناول ایک پوری زندگی بلکہ پورا ہندوستان ہے جس کی وسعت بیلاری گاؤں سے لیکر لکھنؤ شہر تک وسیع ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو حقیقی زندگی میں ہے۔ اس میں شادمانیاں بھی ہیں اور تلخیاں بھی۔ اس میں مصنف کے آئیڈیل کردار بھی ہیں اور انکی آرزوؤں اور آدرشوں کی تصویریں بھی ہیں۔

[۱] ماہنامہ سب رس اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۳۳

GHALIB INSTITUTE, NEW DELHI-2.

اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ترجمانی

گئودان ایک اعلیٰ اخلاقی قدروں کا ترجمان ناول ہے جس میں غریبوں کی حمایت، ناداروں سے ہمدردی، مزدوروں کی بیکسی کے مناظر کسانوں کی مصائب سے پُر زندگی کی مصوّری، واضح طور پر ایک تعمیری و اخلاقی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے۔ اِس میں مذہب کا مقصد خدمت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں استحصال کرنے والے تمام طبقات کی برائی اس فنّی انداز سے کی گئی ہے کہ قاری ان کرداروں سے نفرت کرنے لگتا ہے جو غریبوں اور کسانوں کا لہو چوستے ہیں۔ اِس میں محبّت کا فیضان ہے اس میں معاشرت کے فضائل اخلاق کی تصویریں ہیں۔ اِس میں رزائل اخلاق اور ان عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے جو کبھی مذہب کی آڑ میں خوں خواری کرتے ہیں یا مہاجن کی شکل میں سودی قرض کا جال پھیلاتے ہیں اور کسانوں کی نسلوں کو غلام بناتے ہیں۔ یا زمیندار کے روپ میں خدائی کرتے ہیں یا پولیس کی شکل میں رشوت کے ذریعہ عوام کو پریشان کرتے ہیں۔ یا مِل مالک کی شکل میں مزدوروں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔

پریم چند نے اس دھوکے، مکر، چالبازی اور چالاکی کی جو امیر طبقہ غریبوں کو اپنے دام میں پھنسانے کیلئے کرتا ہے۔ پوری طرح نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ سرمایہ دار طبقہ کن کن عیوب میں مبتلا ہے۔ اِس کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ عوام کن مصائب سے گذر رہے ہیں۔

پریم چند نے گاؤں اور شہر کی جنسی زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ناول کے اخلاقی عناصر میں اہمیت کا باعث ہے دین کے ٹھیکیدار پنڈت داتا دین کا لڑکا..... ایک چمارن سے تعلق پیدا کرتا ہے مگر داتا دین پھر بھی اس کو ذات باہر نہیں کرتے اور خود اس سے قطع تعلق نہیں کرتے۔ اس لیئے کہ وہ ان کا بیٹا تھا مگر ہوری سے گاؤں والے جرمانہ وصول کرتے ہیں۔ پریم چند نے اس بداخلاقی کا پردہ فاش کیا ہے۔ جو دلارے کی دوسری شادی، ماتا دین کے چمارن سے عشق اور گوبر کے جھنیا کو بھگانے کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔ ایسی بداخلاقیاں دیہاتی معاشرہ میں عام ہیں چماروں نے صاف کہا کہ کھانے پینے کیلئے تم برہمن ہو ہم سے دور بھاگتے ہو مگر جنسی تعلق کیلئے سب جائز کر لیتے ہو۔ دیہاتی زندگی کے مسائل میں اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ اعلیٰ درجہ کا ناول ہے جس میں ایثار، قربانی، صبر، شکر، محنت، ہمدردی اور انسانیت نوازی کی تعلیم دی گئی ہے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔

ایک ناقد نے گئودان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ" اس ناول میں زمیندار، کسان، پولیس، پولس اور عوام، شہری اور دیہاتی، ساہوکار اور قرضدار، برہمن اور اچھوت، فرد اور برادری، سرمایہ دار اور مزدور سب ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں اور واضح کرداروں اور نمایاں شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں"۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کردار نہ فرشتے ہیں اور نہ شیطان بلکہ حالات کی چکی میں پس کر وہ اپنی اصل شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس ناول میں کرداروں کا ٹکراؤ کشمکش و کشاکش حیات کی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں ہم کو پوری زندگی اپنی تمام جولانیوں، آرزوؤں،

رعنائیوں، محرومیوں، مجبوریوں اور کشمکشوں کے ساتھ نظر آتی ہے جس میں گوبر مزدور اپنی محنت کے ساتھ، رائے صاحب اپنے دبدبہ کے ساتھ، ہوری کسان اپنی بیکسی کے ساتھ، داتا دین اپنی خود غرض دینداری کے ساتھ، جھنگری سنگھ اپنے مہاجنی مظالم کے ساتھ، پروفیسر مہتا اپنی علمیت اور اعلیٰ تخیل کے ساتھ، مِس مالتی اپنی خدمت و عظمت کے ساتھ اور کھنہ اپنی سرمایہ دار ذہنیت کے ساتھ منصۂ حیات پر نمودار ہوتے ہیں۔ ان کرداروں میں زندگی کی خود غرضیاں، نفسیاتی گتھیاں اور عام انسانی قدریں، سب کچھ ہم کو مِل جاتا ہے۔

اِس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی کی ہلچل نظر آتی ہے۔ اس میں مسائل کا الجھاؤ ہے۔ اس میں حقیقی کشمکشِ حیات ہے۔ اس میں اس عظیم طبقہ کی ترجمانی ہے جو ہندوستانی دیہات میں رہتا ہے۔ اس میں زندگی اور فن باہم گنگا جمنا کا حسین سنگم بن کر سامنے آتے ہیں۔ اِس میں انسانی جذبات کا نکھار ہے۔ اِس میں دیہاتی زندگی کے خدوخال نمایاں ہیں۔

اُردو شاعری اور افسانہ نگاری تھری داستانِ عشق پر مبنی ہے۔ پریم چند نے پہلی بار دیہاتی عشق کی داستان پیش کی۔ انھوں نے جو جنسی تعلقات کے نقشے پیش کئے ہیں۔ وہ نہایت حقیقی ہیں۔ ان میں زندگی کی صحیح تصویریں پوشیدہ ہیں ان میں صحیح انسانی جذبات کی ترجمانی ہے اور نفسیاتی الجھنوں کی

تصویریں ہیں۔ خصوصاً سماجی بندشوں اور جنسی الجھنوں کے نقشے دیہاتوں کی اخلاقی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح سماج اور ہندو مذہب پر نظر ڈالی ہے اس کے ذریعہ بتایا ہے کہ دیہاتی زندگی اور مذہب کا تعلق کتنا گہرا ہو؟ اس کا مطالعہ داتا دین اور گاؤں کے لوگوں کی زندگی پر ان کے اثرات سے کیا جاسکتا ہے۔ ہر موقع پر وہ موجود ہیں۔ ہر جگہ سے ان کو دکشنا ملتا ہے۔ موت و زندگی ہر منظر میں ان کی موجودگی ضروری ہے۔ ہندو تہذیب پر مذہب کے اثرات کتنے گہرے ہیں خصوصاً دیہاتیوں کی زندگی میں اس کا مطالعہ اس کتاب کے آئینہ میں پوری طرح کیا جاسکتا ہے۔ شہری زندگی میں پریم چند نے مذہبی اثرات کی کمی دکھائی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں ہندو نظریۂ تناسخ کی نفی پیش کی ہے۔

غرض ناول اپنی کشمکشوں، کسانوں کی مجبوریوں، دیہاتی عشق کی داستانوں، سماجی پابندیوں، مذہبی اجارہ داریوں، سرمایہ دارانہ عیاریوں، نچلے طبقہ پر مظالم کی داستانوں اور ہندوستانی زندگی کے حقائق کی کہانیوں سے پر ہے۔

ہندو مسلم اتحاد

پریم چند نے اس کتاب کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا عمدہ سبق پیش کیا ہے۔ مرزا خورشید اور ہندو کرداروں کو باہم اس طرح گھلا ملا کر پیش کیا ہے کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ گوبر اور دالہ دین کے معاملہ میں بھی یہ کیفیت سامنے آتی ہے۔ پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش اور قومی یکجہتی کا تصور کئی انداز سے پیش کیا ہے۔ جس کا مطالعہ مندرجہ ذیل عناوین کے تحت کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ہندو مسلم کرداروں کے باہمی معاملات کے ذریعہ۔

(۲) ایک ایسی زبان کے ذریعہ جو اردو اور ہندی کے اتصال سے وجود میں آئی ہے۔

(۳) مذہبی کٹر پسندی اور غلو کے خلاف جذبات پیدا کرکے۔

انھوں نے ایک عام انسانی خدمت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب کردار مہتا کے ذریعہ اس کیفیت کو زیادہ واضح کیا ہے کہ اصل خدمت، خدمت انسانیت ہے اور بس۔

یہاں ہلکی سی شکایت مجھے وہی ہے کہ دیہاتی کرداروں میں ایک بھی مسلم کردار نہیں۔ اگر وہ کسی ایسے مسلم کردار کی تخلیق کرتے جو کبھی توکھے رام کی چوپال میں بیٹھتا، کبھی ماتا دین سے گفتگو کرتا نظر آتا، کبھی ھوری کے یہاں ملتا، کبھی گاؤں کے معاملات میں اس کا ذکر آتا اور

ایک محبت کی فضا میں اِن کیفیات کو پیش کیا گیا ہوتا۔ جیسا کہ آج ہزاروں دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ متمول مسلم کسانوں کے ہلواہے اکثر ہندو ہوتے ہیں۔ پاسی کوری وغیرہ۔ گئودان میں اس طرح کی حقیقت پسندی کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں گاؤں میں ہندو مسلم بھائی بھائی اور دوست بن کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خوشی وغم میں شریک ہوتے ہیں۔ خود مجھے اپنے گاؤں میں اس قسم کے خوشگوار ہندو مسلم تعلقات کا مشاہدہ و تجربہ حاصل ہے۔ اسلیئے اگر وہ ہندو مسلم اتحاد کو مکمل انداز سے پیش کرتے تو اسکے لیئے دیہاتی کرداروں میں کم از کم ایک کردار ضرور مسلم ہونا چاہیئے تھا۔ بہرحال اس کے باوجود کتاب میں ایک محبت اور اتحاد کی فضا مرزا خورشید سے قائم ہوئی ہے۔ بہرحال میں اس کمی کو پریم چند کی خامی تصور کرتا ہوں کہ انھوں نے علاقہ اودھ کے گاؤوں کی زندگی سے واقفیت کے باوجود اس اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا۔

پریم چند نے جو ہندو معاشرہ کی تصویر پیش کی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ یعنی ان کے سارے کردار ہندو ہیں، اسلیئے ان کو ان کی اصلی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس دو کردار مسلم ہیں۔ ان میں مرزا خورشید کا ذکر زیادہ ہے۔ مگر الہ دین کا تذکرہ صرف ایک بار آیا ہے اور اس کا ماحول بالکل مسلم ہے۔ یہاں میں اس بارے میں گئودان کی عبارت نقل کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے۔ گوبر نے شہر کے خرچ کا ذکر کیا اور بیوی کو نہ لانے کا عذر کیا۔ اس پر الہ دین کہتا ہے۔

الہ دین" آمدنی اللہ دے کا بھیا سوچو کتنا آرام ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ

جتنا تم اکیلے خرچ کرتے ہو اسی میں گرہستی چل جائے گی۔ عورت کے ہاتھ میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ خدا قسم جب میں اکیلا رہتا تھا تو چاہے جتنا کماؤں، مگر سب برابر ہو جاتا تھا" (ص ۳۳۱) الہ دین کی شکل یہ تھی "سر منڈا" داڑھی کچھڑی اور کانا" (ص ۳۳۰)

اس کردار سے مسلم معاشرہ کی جھلک ضرور نظر آتی ہے مگر مسلم کردار چونکہ پورے ناول میں مفقود ہیں۔ اسلیئے ایسی ترجمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرزا خورشید کے کردار میں کہیں مسلم تہذیب یا مسلم معاشرہ کی جھلک نہیں آتی۔ پریم چند اگر چاہتے تو اودھ کے گنگا جمنی ہندو مسلم کلچر کی عمدہ ترجمانی اس ناول کے ذریعہ کرسکتے تھے مگر بہرحال انھوں نے جو مقصد اپنے سامنے رکھا اس میں بلاشبہ وہ کامیاب ہیں۔

چونکہ انھوں نے ہندو معاشرے کی ترجمانی کو اپنا مقصدِ حیات بنایا تھا اسلیئے ان کو ہندو عوام اور ہندی میں غیر معمولی مقبولیت وعظمت حاصل ہوئی اور اس کا سبب حقائقِ حیات سے ادب کی مطابقت ہے۔ چنانچہ "ہندی میں گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی مصنف عوام میں ہردل عزیز ہوا ہے تو وہ صرف منشی پریم چند ہی تھے"

پریم چند کو ہندوؤں نے اپنا صحیح ترجمان تصور کیا۔ اسکی وجہ پریم چند کا اصلاحی و اخلاقی نقطۂ نظر ہے جو انھوں نے ہندو معاشرے کی اصلاح کیلئے پیش کیا۔ چنانچہ راج نرائن شری واستو نے ان کی تخلیقات کا موازنہ مذہبی کتابوں کے ساتھ کیا ہے[۲]۔

۱۔ رسالہ ادب دسمبر ۱۹۶۳ء مقالہ پریم چند پر ایک نظر از شکیل احمد فاروقی ص ۱۵

یہاں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پریم چند کی تخلیقات میں مذہبی رسومات مذہبی افکار، ہندو دیومالا، پوجا، پرارتھنا، ہندو عقائد اور تہذیب کی اتنی چھاپ ہوتی ہے کہ ان کو داستواجی نے مذہبی کتابوں میں شمار کیا۔

میرا خیال ہے کہ مقبولیت کے لحاظ سے پریم چند نے اردو میں ہندی سے کم قبول عام حاصل نہیں کیا۔ آج ہمارے ادب میں پریم چند پر تنقید کا خاصا اہم ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور ہمارے رسائل میں برابر ان پر مقالے اور بازار میں ان پر کتابیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ البتہ ان کو مذہبی تقدس اردو میں حاصل نہیں ہے۔ جس کا ذکر راج نرائن سری داستواجی نے کیا ہے۔ لیکن اردو والوں نے ان کی فنی خدمات کو پوری طرح سراہا ہے اور ان سے روشنی حاصل کی ہے اور ان کی راہ ہمارے فن کاروں نے اپنائی ہے۔

ترقی پسندی

جہاں تک پریم چند کے ترقی پسند اور آگے بڑھنے والی قوتوں کا ساتھ دینے کا سوال ہے۔ وہاں یہ امر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت ترقی یافتہ اور بلند نظریات کے حامل تھے۔ انھوں نے گئودان میں خاص طور سے سماج سدھار اور فرسودہ نظریات کی تردید کی ہے۔ انھوں نے طبقاتی کشمکش کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھوں نے توہم پرست سماج کے خدوخال بھی نمایاں کیے ہیں۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام اور اس کے نتیجے میں انسانی مصائب کا ذکر بڑی تفصیل اور عمدہ تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ہم ان کو کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے اور نہ انھوں نے کمیونزم کی حمایت کی ہے۔ وہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں اس لیے کہ اس وقت کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں اس آنیوالی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ و خلافت پارٹی کی طرف سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلا ہے۔ اس سے مجھے کلی اتفاق ہے۔[1]" اس کے باوجود کہ ان کا تعلق کسی پارٹی سے نہ تھا مگر وہ سیاسی اعتبار سے کانگریس کے حامی تھے[2]۔

یہ صحیح ہے کہ وہ کسی پارٹی میں نہ تھے مگر کانگریس کے خیالات سے ان کو پورا اتفاق تھا۔ انھوں نے اسی سے متاثر ہو کر اپنی ملازمت ترک کر دی۔

---

[1] پریم چند کا مکتوب مدیر زمانہ کے نام [2] سب رس اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲۶

انھوں نے گورکھپور میں گاندھی جی کی تقریر سے تاثر قبول کیا۔ انھوں نے کانگرس کے عزائم سے اپنے ادب کو وسیع اور وقیع بنایا۔ وہ بدیسیوں کو ملک سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ اس راہ میں وہ تمام ترقی یافتہ اور انسانیت پرست گروہوں کے ساتھ تھے مگر کسانوں اور مزدوروں کو ملا کر ان کو سرمایہ داروں کے خلاف منظم کرنے کا کام انھوں نے نہ عملاً کیا اور نہ اس طرز کا تخیل اپنے کسی ناول میں پیش کیا۔ انھوں نے انسانوں پر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس آواز میں ملک کے کمیونسٹ عناصر بھی شریک تھے مگر پریم چند باوجود ترقی پسند ہونے کے کبھی اسٹیج پر اشتراکی انقلاب کی تبلیغ نہیں کرتے۔ تعجب ہے کہ پھر بھی بعض ناقد کھینچ تان کر ان کو اشتراکی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سردار جعفری کے مندرجہ ذیل خیالات ملاحظہ ہوں۔

"ان کے ناولوں اور کہانیوں کا بنیادی نقطہ کوئی سماجی یا معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا حل سماجی اور معاشی نہیں ہوتا بلکہ انفرادی ہوتا ہے۔ وہ انقلاب کے بجائے انفرادی اور روحانی سدھار کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور ایک ایسا آدرش وادی طریقہ پیش کرتے ہیں جو ممکن العمل نہیں[1]"۔

"اس طرح پریم چند کے ادب میں ایک بنیادی تضاد پیدا ہوتا ہے اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقیقت کہ کسان بجائے خود آزاد نہیں ہو سکتا اور اسے مزدور طبقے کے اتحاد اور امداد کی ضرورت ہے۔ پریم چند کی نظروں میں تو کیا سیاسی رہنماؤں کی نظروں میں بھی نہیں تھی[2]"۔

یہ تصور صحیح نہیں کہ چونکہ پریم چند کے دور تک مزدور تحریک پروان

---

[1] [2] ترقی پسند ادب از سردار جعفری ص ۱۳

نہیں چڑھی تھی اسلیئے انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کو ملاکر انقلابی راہوں سے مشکلات کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اکثر کسانوں اور مزدوروں کے مصائب و مسائل کا ذکر کر کے آخر میں کبھی تلب ماہیت کرتے ہیں کبھی کوئی کردار دنیا کو چھوڑ کر تیرتھ کرنے چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی زمیندار اپنی زمین کسانوں میں تقسیم کر دیتا ہے یعنی مسائل کا حل مثالیت اور تصوریت کے ذریعہ عمل میں کرتا ہے۔ البتہ صرف گئودان ایک ایسا ناول ہے۔ جس میں سچی اور بے رحم حقیقت پسندی سے مصنف نے کام لیا ہے اور مسائل کا حل پیش نہیں کیا ہے۔

ہوری کی موت کا منظر ایک سہانے، استعجاب اور بھرپور "حقیقت نگاری" پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پریم چند کس حد تک اشتراکی انقلاب کے حامی تھے؛ انھوں نے ترقی پسند مصنّفین کے پہلے جلسہ کی صدارت بھی کی تھی مگر اس سے ان کو اشتراکی ثابت کرنا صحیح نہیں وہ بہر حال ہندو کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ خود سردار جعفری لکھتے ہیں "ان کی وہ کہانیاں بھی ہندو گھرانوں کے سدھار کے لئے لکھی گئی ہیں سماجی مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔[۱]" میں نے ہندی میں ان کے ایک افسانہ کا مجموعہ پانچ پھول پڑھا تھا۔ جس میں ایک کہانی کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ ایک گاؤں میں مجاہدین نے آکر ہندوؤں کو لوٹ لیا اور مار ڈالا بعض لوگ مسلمان ہو گئے مگر ایک عورت جس کے شوہر نے مذہب نہ ترک کیا بلکہ اپنی جان اس راہ میں دیدینا گوارا کر لیا۔ اس کی بیوہ اس کی قبر کے پاس مندر بنا کر

۱۔ ترقی پسند ادب ص۔ ۱۳۰

اپنے اعلیٰ تخیل کی راہ میں زندگی گذارنے لگی ہے۔ مجھکو اس وقت ان کا یہ متعصبانہ طرز کچھ اچھا نہ معلوم ہوا مگر بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ ان کا عام رنگ نہیں ہے۔ پھر بھی ایک امر پر مجھے پورا انشراح صدر ہے وہ یہ کہ پریم چند کے سامنے ہندوؤں کی اصلاح کا مقصد ہے وہ بہرحال ایک تہذیب اور ایک مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ذہن وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ ان کا اصلاحی ادب اشتراکی ادب سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔ گئو دان میں غالباً ایک جگہ کسی سوشلسٹ کا ذکر آیا ہے۔ باقی سارے کردار سماجی حقائق اور معاشی حقیقت نگاری کا آئینہ ہیں۔ اس کتاب میں اگر کوئی تبلیغ ہے تو وہ وطن کی آزادی، کانگرس اور قومی تحریک سے خلوص، استحصال کرنے والے طبقات سے نفرت اور پسے ہوئے کسانوں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ پریم چند کے یہاں تضاد نہیں ہے۔ ان کو ان کے دور کے حالات کے آئینہ میں رکھکر دیکھنا چاہیئے۔ ان کی مثالیت، رجائیت اور قلب ماہیئت کا مرجع ان کی مذہبی تربیت ہے ان کا وہ ہندو کلچر ہے جو ان پر چھایا تھا۔ اب جہاں تک ان عناصر کا گئو دان سے تعلق ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب خالص حقیقت نگاری کا آئینہ ہے اس میں کسانوں کی زندگی کو ایک خاص انداز سے دکھایا گیا ہے مگر شہری کرداروں میں وہی مثالیت نظر آتی ہے۔ اس مثالیت اور عینیت کا سرچشمہ کہاں ہے؛ اس کا سرچشمہ ہندو فلسفۂ زندگی میں ملتا ہے۔ میں اس تشریح کیلئے کوئی جواز نہیں پاتا کہ انھوں نے پسے ہوئے طبقات کے مصائب بیان کرکے ان کو مثالیت اور روحانیت اور انفرادی اصلاح سے اس بنا پر حل کیا کہ

وہ کسانوں اور مزدوروں کے اتحاد کے ذریعہ انقلاب کرنے کے راز سے بے خبر تھے۔ یہ محض کھینچ تان بلکہ اپنے نظریہ کو پریم چند پر تھوپنا ہے۔ وہ روحانیت کے قائل تھے وہ انسان کی خدمت کو اصل حیات تصور کرتے تھے روحانیت کا یہ تصور مہتا اور مالتی کے کردار میں نظر آتا ہے۔ وہ دونوں کو غیر شادی شدہ رکھنا چاہتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آنے والی ہستیوں میں اپنی صلاحیت ضائع کرنے کے بجائے ان سے سماجی صلاح و فلاح کا کام لینا اولیٰ ہے۔ یہ تصور بھی ہندو کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ باوجود چار و ان کے تصور کے اکثر سادھو آغازِ عمر سے تیاگ اختیار کرتے ہیں اور اپنی عمر و صلاحیت کو مذہب و روحانیت کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ پریم چند نے اتنی اصلاح کی ہے کہ صلاحیت کو انسانوں کی خدمت میں صرف کرنے کی راہ اختیار کی ہے۔ اور یہی دراصل مذہب کا مقصد ہے۔ مہتا اسی نقطۂ نظر کو بار بار پیش کرتا ہے کہ اصل مذہب اور اصل خدا کا تصور بغیر انسان کی خدمت کے ممکن نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر سید احتشام حسین جو زیادہ حقیقت پسند اور معتدل مزاج ناقد ہیں، انھوں نے پریم چند کی عظمت کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اردو اور ہندی میں پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔ یہ پریم چند کے شعور کی بات نہیں ہے نہ صرف یہ کہنے سے کام چل سکتا ہے کہ وہ انگریزی فرانسیسی روسی اور بنگالی ناول نویسوں سے متاثر ہیں بلکہ اسکی جستجو ان طبقوں کے بدلتے ہوئے مزاج میں کی جانی چاہیے۔

جن میں وہ پیدا ہوئے اور جن کے ساتھ ان کی ہمدردیاں تھیں۔ بیسویں صدی کے اس ہندوستان کو دیکھنا چاہیئے جو ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد کر رہا تھا اور جس کی رہنمائی اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ذہین محب وطن کر رہے تھے اور اس ہندوستانی سماج پر نظر ڈالنی چاہیئے جس میں معاشی حالات کے ماتحت طبقاتی کشمکش بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔¹

احتشام صاحب نے سماجی زندگی اور معاشی کشمکش کی بات کہی ہے مگر براہ راست مزدور و کسان کے اتحاد کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ یہ تصور پریم چند کے ادب کے بارے میں حقیقت سے خالی ہے بلکہ اس کے بجائے انھوں نے کانگریس، تحریک آزادی، کسانوں اور زمینداروں کے درمیان معاشی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے پریم چند کے تصورات اور ان کے عظیم ناول گئودان کے خیالات کا سرچشمہ ذہن میں آسکتا ہے اور یہ تجزیہ زیادہ صحت مند اور حقیقت سے قریب تر ہوگا۔

---

¹ پریم چند از ہنس راج رہبر ملاحظہ ہو پیش لفظ از پروفیسر احتشام حسین۔

اشتراکیت

اشتراکی ناقد پریم چند کے یہاں بلکہ اُردو کے تمام بڑے فن کاروں کے یہاں تضاد محسوس کرتے ہیں، یہ تضاد ان کو ان کی مذہبیت، اخلاقی قدروں اور حیات و کائنات کے بارے میں غیر اشتراکی نقطۂ نظر کے باعث محسوس ہوتا ہے۔ ان ناقدوں کا کہنا ہے کہ اگر پریم چند کا ناول "منگل سوتر" مکمل ہو گیا ہوتا تو ان کا اشتراکی تصورِ حیات واضح ہو جاتا۔ پریم چند کی زندگی، تصورِ حیات اور مقاصد میں ہندو مذہبی اقدار کا غلبہ تھا وہ باوجود ترقی پذیر تصورات کے بنیادی طور پر ہندو اخلاقیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا دامن مذہب سے اور ان اخلاقی پیمانوں سے جو ان کو ورثے میں ملے تھے پُر ہے۔ وہ ان مصائب کو جن سے اپنے ہیروں کو گھرا ہوا دکھاتے ہیں۔ ترقی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انھیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔"[1]

وہ گوشۂ عافیت میں فرماتے ہیں:۔

"دنیا میں سب سے بڑا منتر اپنی محنت، جانفشانی اور استقلال ہے اس کے سوا اور سب منتر جھوٹے ہیں۔"[2]

۱؎ دیا نرائن نگم کے نام پریم چند کا خط زمانہ پریم چند نمبر ص ۱۱۵

۲؎ گوشۂ عافیت ص ۲۲۳

مسلسل مصائب نے انھیں قسمت پرست بنا دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

"اس تجربہ نے مجھے پکا قسمت پرست بنا دیا ہے اب مجھے پورا یقین ہے کہ خدا کی جو مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے اور انسان کی کوشش بھی اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی" [1]

ان کا عقیدہ تھا کہ :- "اگرچہ اس کائنات کے پیچھے کوئی ہاتھ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اسے انسانی اعمال سے کچھ لینا دینا ہے" [2]۔

"گئودان میں وہ پیغام دیتے ہیں کہ اپنا بھاگ خود بنانا ہوگا۔ اپنی عقل اور ہمت سے ان تکلیفوں پر فتح پانا ہوگا" [3]

اہنسا، پریم، چھما، دیا، تیاگ اور سیوا بھاؤ کو وہ انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیتے ہیں" [4]

ان مختلف علمی، روحانی، اخلاقی اور مذہبی عناصر کو باہم دست و گریباں دیکھ کر ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں کہ "پریم چند کے اکثر کردار زندگی کے مادی رشتوں کا واضح شعور نہیں رکھتے یا رکھتے ہیں تو کسی خاص منزل پر نظر انداز کر دیتے ہیں اس طرح ان کا عمل گمراہ ہو جاتا ہے اور انھیں شکست ہوتی ہے" [5]

پریم چند کے مذکورہ بالا خیالات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کا، مذہب کا، خدمت کا اور زندگی کی جد و جہد کا وہ تصور رکھتے ہیں جو ہندو اخلاقیات میں پایا جاتا ہے۔ اس پر کھینچ تان کر کسی فلسفہ یا نظام حیات کی مہر لگانا

عہ زمانہ پریم چند نمبر ص ۹ — عہ پریم چند ایک دو بچن ص ۱۵۶

عہ علی گڑھ میگزین شمارہ (۱) ۱۹۵۹ء ص ۱۳۶

عہ " " " ص ۱۳۶

عہ " " " ص ۱۳۷

یقیناً تضاد پیدا کرے گا۔ پریم چند کے جن ناقدوں نے تضاد کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بہ حقیقت فراموش کردی کہ اشتراکی نظام ایک مربوط فلسفہ رکھتا ہے اگر پریم چند اسکے حامل ہوتے تو ان کے ناولوں میں اتنی غیر معمولی مذہبیت نہ ہوتی۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ :۔

"پریم چند انسانی زندگی کو محبت ایثار اور انصاف جیسے اخلاقی سلمات کا تابع دیکھنا چاہتے ہیں اور یہیں آکر ان کی فکر کا تضاد رونما ہوتا ہے"[1]

حق یہ ہے کہ جہاں ان کے یہاں سماجی ناانصافی کا ذکر آتا ہے۔ ہندوستانی کسان اور مزدور کے ساتھ سرمایہ داروں کے استحصال کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہمارے ناقد خیال کرتے ہیں کہ وہ اشتراکیت کی ترجمانی ہے مگر اصلاً پریم چند کانگریسی ہیں۔ ہندو ہیں اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کو نئے ترقی یافتہ معیار سے دیکھنا چاہتے ہیں یہ وہ حقیقت ہے جو اس دور کے تمام ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ بلکہ آزاد خیال ہندوؤں میں پائی جاتی تھی یہ لوگ آزادی کی جدوجہد میں آزمائش سے سرشار اور اپنے وطنی سرمایہ پر نازاں اور وطن کیلئے سراپا سوز بے سینہ سپر کئے۔ میدان میں سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ خود پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں جو قومی تحریک اٹھی اس پر ہندو احیائے مذہب و تہذیب کے جذبات غالب تھے"[2]

یہ ہے پریم چند کے تصور حیات کا صحیح تجزیہ۔

---

[1] علی گڑھ میگزین شمارہ ۱۹۵۹ء مرتبہ حسن مثنیٰ انور ص ۱۳۶
مقالہ پریم چند کا تصور حیات از ڈاکٹر قمر رئیس۔
[2] ملاحظہ ہو ترقی پسند ادب از سردار جعفری۔

پریم چند کے یہاں بدی کو مٹانے کیلئے تشدد کا فقدان ہے۔ ان کے کردار بھگتی اور آشرم میں پناہ لیتے ہیں۔ البتہ ہوری کو ناکام دکھلانے کے باوجود اس کو زندگی کی جدوجہد سے دور نہیں کیا گیا ہے۔ ہوری سراپا حقیقت اور سراپا سوزِ حیات بن کر سامنے آتا ہے۔

پریم چند کسی مخصوص فلسفہ کے نہ ترجمان ہیں اور نہ کسی انقلاب کے داعی۔ البتہ وہ کانگریس کے مقاصد کو پسند کرتے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد میں مشکلات و مصائب کا سامنا کرتے ہیں۔ اردو سے ہٹ کر ہندی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس دور میں ہند و احیائے ملت کے تصور کو پیش کرتے ہیں مگر یہ تصور تعصب کا ترجمان نہ تھا۔ انھوں نے در اصل کانگریس کے آئیڈیل کو اپنایا ہے اور اگر زندہ رہتے تو کانگریس کے سوشلزم کو بھی اپناتے اس کی علامتیں پروفیسر مہتا کے خیالات میں ظاہر ہوتی ہیں۔

فسانۂ آزاد، امراؤ جان ادا اور گئودان

جہاں تک امراؤ جان ادا کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنوی تہذیب کی داستان ہے۔ رنڈی اگرچہ ایک ایسے طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جو معاشرہ میں مطعون تھا۔ اس کی جانب کوئی توجہ کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ مگر جہاں تک اس کی مالی حیثیت کا تعلق ہے وہ زیادہ تر صاحبِ حیثیت اور دولت ہوتی تھی۔ خود امراؤ جان ادا نہایت اعلیٰ زندگی گذارتی تھی وہ عملاً اپنا پیشہ چھوڑنے کے بعد سوامے کہتی ہے کہ مرزا صاحب میرے پاس پہلے کا کافی اندوختہ موجود ہے جو عمر گذارنے کیلئے کافی ہے۔ وہ ہمیشہ نوکر رکھتی ہے۔ امیروں، راجاؤں اور اور نوابوں سے تعلقات پیدا کرتی ہے اور امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتی ہے۔ کربلا زیارت کرنے جاتی ہے۔ سارا ماحول، بنگلوں، تعیش پرستی اور لکھنوی ٹھاٹھ باٹ کا اس میں نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس گئودان میں ہوری کا کردار ہندوستانی کسان کی غربت و افلاس، مجبوری و یاس اور مصائب دہر کا عمدہ نمونہ ہے جو کبھی کسان رہتا ہے مگر جب کھیت رہن کر دیتا ہے تو مزدور بن جاتا ہے۔ اور داتا دین کی مزدوری کرنے لگتا ہے۔ اس میں بھی شہری زندگی میں راجے مہاراجے آتے ہیں اور جدید شہری زندگی کی تصویریں ملتی ہیں مگر وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ میرے خیال سے یہ حصہ گئودان کا عیب بھی ہے۔ جس طرح مرزا رسوا نے رنڈی کو ہیروئن بنا کر ایک نئی بات کی تھی اور اسکے ذریعہ لکھنو کی زبان، بیگماتی زبان اور لکھنوی تہذیب کی ترجمانی کی تھی اسی طرح پریم چند نے مفلس و

مفلوک الحال کسان کی زندگی، زبان اور ماحول کی ترجمانی کر کے اس سے کہیں زیادہ عزت وعظمت حاصل کی اور اس سے کہیں زیادہ خدمت کی۔ انھوں نے وہ ماحول پیش کیا جس کو سامنے لانے کی دوسروں کو جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی انھوں نے ایک ایسے طبقے کو اپنا ہیرو بنایا جس سے ہم کو ہمدردی کے ساتھ لگاؤ ہے اور اس کی زبان کے ساتھ حقیقی ہندوستانی فضا محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے جذبات ومحسوسات میں حقیقت کے جلوے متموج ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری کسانوں کی صدیوں کی مصیبت وآلام کو سر پر اٹھائے ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا مقابلہ امراؤ جان سے کرنا حقائق سے آنکھیں چرانا ہے۔ امراؤ جان سے ہندوستانی زندگی رسوا کے دور کے ہندوستانی عوام کے مصائب اور مسائل کسانوں اور مزدوروں کی .... مشکلات اور ملک کی اکثریت کی تہذیب، زبان اور دکھ بھری زندگی کی نہ ترجمانی ہوتی ہے اور نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں کروڑوں انسان زندگی کے لطف وآرام سے محروم ہیں اس میں ہر جگہ لکھنؤ کا آسودہ وزوال آمادہ ماحول ملتا ہے۔ جس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سماج اتنا گر گیا ہے کہ اس میں لڑکیاں فروخت ہوتی ہیں اور ان سے تجارت کی جاتی ہے۔

سرشار نے نوابی ماحول اور بیگماتی زبان اور لکھنؤ کا روزمرہ اور اس کی تہذیب کی بھرپور ترجمانی کی ہے مگر اس میں بھی در اصل جاگیردارانہ ماحول ہے۔ اس میں عوام کی جھلکیاں کم ہیں۔ اس میں عشق وحسن کی داستانیں تعیش مشاغل کی کہانیاں، نوابوں اور مصاحبین کے قصے لکھنؤ کا شیعہ ماحول اور محرم، میلے ٹھیلے اور معاشرتی رنگینیاں پورے شباب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں

مگر آزاد تو نواب ہی ہیں جو عشق میں روس و روم کی جنگ میں چلے جاتے ہیں اور خوجی افیون کے نشہ میں ہر وقت ڈینگ ہانکتا ہے مار کھاتا ہے پھر اکڑتا ہے۔ مگر نواب صاحب کی جی حضوری سے کبھی باز نہیں رہتا۔ وہ جاگیردارانہ ماحول کا پروردہ ہے اور اس کا انداز فکر عوامی نہیں۔ سرشار کی خوبی صرف اتنی ہے کہ انھوں نے عہد انحطاط کے لکھنؤ کو از سر نو زندہ کر دیا ہے۔ جس میں تیتربازی بٹیربازی، عشق بازی اور وہ تمام سامان تعیش موجود ہے جو لکھنوی معاشرے میں موجود تھا اور جس نے لکھنوی ماحول میں مادیت کے غلبے کے باعث وہاں کی شاعری سے تصوف کے عنصر تو کم کر دیا اور وہاں کے تغزل کو کم عیار بنا دیا تھا۔ ایسے ماحول اور کرداروں کے مقابلہ میں ہوری اس طرح ابھر کر سامنے آتا ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ ہوری اور خوجی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ خوجی بے عمل ہے وہ محنت کر کے رزق نہیں کماتا۔ وہ آزاد کی مصاحبی اور تملق میں زندگی گذارتا ہے۔ قدیم و فرسودہ قدروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ بے عقلی کی باتیں کرتا ہے اور ساٹھ برس کی عمر ہونے کے بعد بھی عقل سلیم سے محروم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کردار پر نوابوں کا عکس ہے وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا نہایت جھگڑالو ہے۔ اس کے برعکس گئودان میں۔ ہندوستانی زندگی ابھرتی اور نکھرتی ہے اور نچلے طبقہ اور عوام کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ہوری کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا کہیں وجود تک سرشار کے یہاں نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے خوش کن واقعات کی مزاحیہ تصویریں ہیں۔ سارے ناول پر خوشی و مسرت کی فضا ہے۔ مگر گئودان دل کا دکھ، مجبوری کی تلخی اور یاس کا خزانہ ہے جہاں عوام کے جذبات اور

کسان کی ذات بے پردہ نظر آتی ہے۔ مرزا رسوا کی ہیروئن بدعمل اور سرشار کا ہیرو بے عمل ہے مگر پریم چند کا ہیرو سراپا عمل ہے۔

گئو دان کی ابدیت ایک اہم مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ناول کسانوں کی حالت سدھرنے کے بعد اپنی اہمیت کھو بیٹھے گا؟ کیا ہوری کی عظمت آئندہ باقی نہ رہے گی۔ میرے خیال سے یہ سوال اٹھانا صحیح نہیں اسلئے کہ عظیم فنکار زندگی کے حقائق کو مجرد انداز میں بیان نہیں کرتا بلکہ وہ انسانی زندگی کی گہرائیوں میں گھستا ہے اور اعلیٰ افکار سے زندگی کی مصوری کرتا ہے کہ اس سے فکر کے چشمے پھوٹتے ہیں اور دل کی دولت عام ہوتی ہے۔ اگر ٹالسٹائی نے صرف روسی سماج کی تصویرکشی کی ہوتی اور گوئٹے صرف جرمن سماج کا مصور ہوتا تو ان کو آفاقیت کی عظمت حاصل نہ ہوتی۔ اس سلسلہ میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے بڑی عمدہ بات کہی ہے وہ رقمطراز ہیں کہ "اعلیٰ ادب ادیب کی شعوری قوت کا نتیجہ ہوتا ہے اسے اس کے وقتی تجربات اور ہیجانات کا نتیجہ قرار دے کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اچھا ادب وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز ہوتا ہے[1]"

پریم چند کا فن آج سارے انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ انھوں نے ہوری کی شکل میں اس انسان کو پیش کیا ہے جو صدیوں سے ذلت و مسکنت، دکھ و درد اور استحصال کا شکار تھا۔ زمانہ گذرنے پر اس کردار کی عظمت بڑھے گی۔ اسلیئے کہ اس میں انسانی سماج میں بے انصافی کی

---

[1] ادب اور سماج از پروفیسر احتشام حسین۔

دردناک داستان پوشیدہ ہے۔ اس میں انسانیت بھوکی اور ننگی کھڑی ہے۔ اس میں انسان کے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ایک دور کی استعماری طاقتوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ غریب کسان کی زندگی کا صحیفہ اصل خد وخال کے ساتھ موجود ہے یہ وہ دستاویز ہے۔ جس سے تاریخ کے صفحات بھی عاری ہیں۔ یہ وہ خزانہ ہے جس سے ہزاروں برس کا ہندوستان مصور ہو گیا ہے۔ یہ وہ عظیم کتاب ہے۔ جس سے ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ کسانوں کی زندگی ان کے مشاغل، ان کے مسائل، ان کے احساسات، ان کی نفسیات اور ان کے انداز و مراحل زندگی کی داستان پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ سردار جعفری لکھتے ہیں:۔

"پریم چند سے پہلے ہندوستان میں بہت سے کسان آباد تھے۔ لاکھوں اور کروڑوں لیکن ان کے نام نہیں تھے۔ انھیں کوئی جانتا نہیں تھا دیہاتی کا لفظ سادہ لوح، بیوقوف اور احمق کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن پریم چند نے ہوری، دھنیا اور بلراج کی تخلیق کر کے ان گمناموں کو نام اور بے زبانوں کو زبان دے دی۔ موجودہ نسلیں ہوری اور دھنیا اور بلراج کے ذریعہ سے اپنے عہد کی حقیقت کو سمجھیں گی اپنے سماج کی ناانصافیوں اور سماجی اداروں کے نظام کے خلاف احتجاج کریں گی اور پریم چند کی تنقید کی اہمیت کو سمجھ کر اس نظام کو بدل دیں گی اور آنے والے ان کرداروں کے ذریعہ سے اپنے ماضی کو جانیں گے اور کبھی اس نظام کو آنے نہیں دیں گے جو ہوری کی جان لے لیتا ہے۔ یہ ہے پریم چند کی عظمت اور اہمیت اور ان کے کرداروں کی ابدیت۔ پریم چند کے ہیرو بیکار لوگ نہیں ہیں۔ نہ چور اچکے، اٹھائی گیرے،

قاتل اور دغاباز ہیں۔ ان کے ہیرو محنت کش انسانیت سے آتے ہیں جو ظلم و نا انصافی کے نظام کو بدل دینے کے خواہش مند ہیں ؎۱"۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ پریم چند کے ناول کو مستقبل میں کس طرح ایک تاریخی دستاویز کا درجہ دیا جائے گا؟ میرا خیال ہے کہ ان کے اس ناول کو مستقبل کے فن کاروں کو ایک صحیفۂ انسانیت" کا مقام عطا کرنا پڑے گا۔ یہ انسانی کشمکش، معاشی بیکسی اور مجبوریٔ حیات کی ایسی داستان ہے جہاں انسانی زندگی انسانوں کے ہاتھوں لہولہان کھڑی ہے۔ مستقبل ماضی سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ سماجی ادب کی تاریخ میں گئو دان ایک مضبوط و مستحکم دیوار کی طرح کھڑی ہے پریم چند نے ہندوستانی کسانوں کے ذریعہ اس ادبی عمارت کو قلعہ سے زیادہ مضبوط اور سماجی حقیقت نگاری کے ذریعہ شمع سے زیادہ پرنور بنا دیا ہے، ہندوستانی کسان کی زندگی اسکے مسائل اور ظالم و مظلوم طبقات کی کہانی اس سے زیادہ صحت، جامعیت اور حقیقت پسندی کے ساتھ عوامی اسلوب میں اس سے قبل کسی فن کار نے پیش نہ کی تھی۔ اس لیے یہ ناول حیاتِ جاوداں کا حامل ہے۔ اس کی آواز سارے ہندوستان کی آواز ہے۔ اس کا غم سارے ہندوستان کا غم ہے، اور اس کی معاشی مجبوری و بیکسی سارے ہندوستان کی بیکسی ہے۔ اس کو محض ایک دور کی داستان کہنا بھی صحیح نہیں اسلیئے کہ ہوری کی ذات میں صدیوں کا کچلا ہوا جاگیردارانہ مظالم کا شکار کسان کھڑا ہے۔ جس نے کبھی زندگی کو آزاد نہیں پایا۔ پریم چند نے ہزاروں برس سے مجبور و مقید طبقے کی ترجمانی

؎۱ ترقی پسند ادب از سردار جعفری ص ۱۸۱

کرکے تاریخ انسانی کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسی بنا پر میں گئودان کو اردو کا سب سے عظیم ناول تصور کرتا ہوں۔ فسانۂ آزاد اور امراؤ جان ادا دونوں نوابی دور کی خوبیاں رکھتے ہیں۔ دونوں آسودہ حال طبقہ کے افراد سے بحث کرتے ہیں۔ خوجی مصاحب ہے۔ بغیر محنت کئے کھاتا ہے اور خوش دلی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ زوال آمادہ تمدن کا نمائندہ ہے۔ امراؤ جان ادا کا طبقہ نہایت اقلیت میں ہے۔ وہ ہمدردی تو حاصل کر لیتی ہے مگر اس کو کوئی اپنی ہیروئن نہیں بنا سکتا۔ وہ آرام و آسائش سے رہتی ہے۔ پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں۔ سرمایہ دار طبقہ سے اس کے تعلقات ہیں۔ وہ جاگیردار نہ ہوتے ہوئے بھی اس طبقہ سے پوری طرح وابستہ ہے۔

ان دونوں ناولوں میں عوامی زندگی کی عظمت کا پتہ نہیں۔ یہ دونوں شہری زندگی کے مخصوص لکھنوی ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ مگر گئودان میں اصل ہندوستانی دیہات کی تصویریں حقائق کے جلوے بکھیرتی ہیں۔

(⁂)

حقوقِ نسواں

پریم چند نے معاشرے کے ایک پسے ہوئے طبقہ کی جانب خاص طور سے توجہ کی ہے۔ انھوں نے عورتوں کے حقوق کی طرفداری کی ہے اور مختلف واقعات اور مختلف کرداروں کے ذریعہ اس طبقہ کو ابھارنے اور اس کی مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مرزا خورشید سروج' میناکشی' گوبندی' دھنیا' مسٹر مہتا اور مس مالتی کے کرداروں میں ایسے خیالات پیش کیے ہیں جن سے عورتوں کی عزت' عظمت اور معاشرہ میں ان کے مساوی و بنیادی حقوق کی حفاظت کا تصوّر ذہن میں آتا ہے۔

کسانوں اور مزدوروں کی طرح یہ طبقہ بھی صدیوں سے ظلم و زیادتی کا شکار رہا ہے۔ پریم چند نے جب اپنے معاشرہ پر نظر دوڑائی تو انھوں نے دیکھا کہ مرد مختلف رواجوں اور روایتوں کے ذریعہ عورتوں کو دباتے ہیں اور نہایت ظالمانہ سلوک ان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پریم چند نے عورتوں اور مردوں کیلئے یکساں حقوق کی پاسداری کی ہے دونوں کو ساتھ کھیتوں میں محنت کرتے دکھایا ہے۔ مس مالتی کی عظمت بسا اوقات مسٹر مہتا سے بڑھ جاتی ہے خود مہتا اس کی محنت و عظمت کے قائل نظر آتے ہیں۔

مرزا خورشید نے تجویز پیش کی کہ طوائفوں کی منڈلی بنا کر ان سے ناٹک کرایا جائے اس طرح ان کو رزق مل جائے گا اور ان کی عزت بھی برقرار رہے گی۔ مرزا کے خیال میں دو ہی طرح کی عورتیں طوائف جیسے مذموم پیشہ کو اختیار کرتی ہیں۔

جنھیں یا تو اپنے گھر میں کسی وجہ سے باعزت قیام نہیں ملتا یا جو مالی تکلیفوں سے مجبور ہو جاتی ہیں" مرزا نے اس کو مالی مسئلہ اور رزق کا معاملہ قرار دیا۔ مہتا کہتے ہیں کہ "مرزا صاحب جب تک دنیا میں دولت والے رہیں گے بیوائیں بھی رہیں گی"۔ وہ پورا سوشیل نظام بدلنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔[۱]

طبقۂ نسواں کے حقوق کی ترجمانی میناکشی کے ذکر میں اچھی طرح کی گئی ہے۔ وہ روشن دماغ عورت تھی جو زنانہ کلب کی ممبر تھی۔ اخباروں میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں پڑھتی تھی وہ سوشلسٹ پارٹی میں کام کرنے لگی۔ اسکی مشکل ان الفاظ میں پریم چند نے بیان کی ہے۔

"عام ہندو لڑکیوں کی طرح میناکشی بھی بے زبان تھی۔ باپ نے جس کے ساتھ بیاہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن زن و شوہر میں محبت نہ تھی دگ بجے سنگھ عیاش بھی تھے اور شرابی بھی۔ میناکشی اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی اور کتابوں اور رسالوں سے دل بہلایا کرتی تھی۔ دگ بجے سنگھ کی عمر تو تیس سال سے زیادہ تھی۔ پڑھا لکھا تھا۔ مگر بڑا مغرور اور اپنے خاندانی وقار کی ڈینگ مارنے والا اور بے رحم وہ بخیل گاؤں کی کم ذات والی بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالا کرتا تھا صحبت بھی کمینوں کی تھی جنکی خوشامد نے اسے اور بھی غرور پسند بنا دیا تھا۔ میناکشی ایسے شخص کی عزت نہ کر سکتی تھی۔"[۲]

میناکشی نے مس سلطانہ کے مشورہ سے اس پر نان نفقے کا دعویٰ کر دیا اور اس نے ان پر بد چلنی کا الزام لگایا۔ اس کا مقدمہ خارج ہو گیا مگر میناکشی کی اس پر ڈگری ہو گئی۔ ایک دن غصہ اور انتقام میں وہ دگ بجے سنگھ کے

۱۔ گئودان ص ۵۲ ۲۔ گئودان ۵۳۴

یہاں پہونچی وہاں رنڈی کا ناچ ہو رہا تھا۔ اس نے سب کو ہنٹر لگانے شروع کر دیئے دِگ بجے سنگھ کو بھی مار کر اتو کر دیا۔ رنڈی کی طرف بڑھی تو اس نے خوشامد کی" مینا کشمی نے اس کی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا" ہاں تو بے قصور ہے جانتی ہے نا کہ میں کون ہوں چل جا۔ یہاں کبھی نہ آنا ہم عورتیں مردوں کی تفریح و تعیش کا سامان ہی تو ہیں تیرا کوئی قصور نہیں۔[۱]"

مرد عورتوں سے کام بھی لیتے ہیں عیاشی بھی کرتے ہیں اور ان کو بے بس و بے کس چھوڑ کر کبھی چلے بھی جاتے ہیں۔ کبھی ذلت میں مبتلا کرتے ہیں اور کبھی سرمایہ داروں کی طرح ان کا خون چوستے ہیں اور نوکروں کی طرح ان سے کام لیتے ہیں۔ اس کیفیت کی غمازی پریم چند نے سلیا کے کردار میں کی ہے۔ ماتا دین نے سلیا کی آبرو ریزی کی۔ اس کو صرف کھانا اور کپڑا ملتا تھا۔ مگر بقول داتا دین کے وہ تین مزدوروں کے برابر کام کرتی تھی اس پر بھی اسکو کوئی اختیار نہ تھا حتیٰ کہ خود ماتا دین محض جانوروں کا سا تعلق رکھتا تھا جس میں انسانیت و شرافت کا کہیں پتہ و نشان نہ تھا۔ اس کی ایک تصویر اس عبارت میں دیکھیے۔

"جب کہ سلیا دو پیسہ کا گلابی رنگ دلاری سے لائی تھی وہ تقاضہ کرنے آئی۔ اس وقت ماتا دین موجود تھا اور سلیا اناج اسارہی تھی جیسے ماتا دین نے یہ تقاضہ سنا ڈر گیا کہ کہیں روپیے نہ دینے پڑ جائیں۔ وہ کھسک گیا سلیا نے اسی اناج سے اندازہ کر کے تھوڑا سا دیدیا۔ اناج دیتے ہی ایک پیڑ کی آڑ سے ماتا دین نکل آیا اور بولا کہ ستھانی لوٹ نہ مچاؤ فوراً اناج چھین لیا اور سلیا سے

---

[۱] گئودان ص ۵۵۲

بولا کہ تو کون ہوتی ہے۔ میرا اناج دبنے والی ؟ سلیا نے کہا" تمھاری بتیج پر میرا کچھ اختیار نہیں ہے ؟ ماتا دین آنکھیں نکال کر بولا" نہیں تیرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کام کرتی ہے کھاتی ہے۔ جو تو چاہے کھا بھی اور لٹا بھی تو یہ نہ ہوگا۔ اگر تجھے یہاں پرتہ نہ پڑتا ہو تو کہیں اور جاکر کام کر مجوروں کی کمی نہیں ہے سینت میں کام نہیں لیتے کھانا کپڑا دیتے ہیں۔ سلیا نے اس چڑیا کی طرح جسے مالک نے پر کاٹ کر پنجرے سے نکال دیا ہو، ماتا دین کی طرف دیکھا۔ اس کی چتون میں درد زیادہ تھا یا شکوہ یہ کہنا مشکل ہے۔ وہ بیاہتا نہ ہوکر بھی فطرتاً وعملاً بیاہتا تھی اور اب ماتا دین چاہے اسے مارے یا کاٹے اسے دوسرا سہارا نہیں۔ اسے وہ دن یاد آئے اور ابھی دو سال بھی تو نہیں ہوئے جب یہی ماتا دین اس کے تلوے چاٹتا تھا۔ جب اس نے جنیو ہاتھ میں لے کر کہا تھا سلیا جب تک دم میں دم ہے۔ تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا" (۴۰۹)

یہاں مرد کی بے وفائی اور عورت کی مجبوری کا بڑا اچھا نقشہ پریم چند نے پیش کیا ہے۔ واقعی ہمارے معاشرہ میں عورت نہایت مجبور رہی ہے وہ معاشی طور پر مرد پر انحصار کرتی ہے۔ اسکی معاشی زندگی پوری طرح مرد پر منحصر ہے۔ وہ جس طرح چاہے رکھے پھر فطری مجبوریاں بھی اس کے ساتھ ہیں۔ عیاشی مرد کرتے ہیں اور الگ ہوجاتے ہیں بھگتتی عورتیں۔ اس کا ایک ہلکا سا عکس پریم چند نے جھنیا کے ذکر میں پیش کیا ہے کہ وہ بیچاری دوجی سے جیتی تھی مگر اس کا کوئی گھر نہ تھا سماج میں بدنامی مرد کی کم اور عورت کی زیادہ ہوتی ہے۔ حالانکہ دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں۔ جھنیا یہی سوچتی ہے کہ وہ بیوہ تھی۔ اب گوبر کی وجہ سے اسکو سماج اور گھر دونوں جگہ سے رسوائی ملی وہ کہاں جائے۔

گوبر لکھنو جانے لگا تو اس نے اس کو اپنے گھر روانہ کیا۔ جھنیانے ہوری سے کہا کہ دادا چاہے مارو چاہے گالی دو مگر اپنے گھر سے نہ نکالو۔ اس کی التجا عورت کے دل کی آواز ہے وہ ہر صورت میں شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ جھنیا کی بیچارگی سماجی زندگی کے اس طرح کے معاملات کی عمدہ تصویر ہے جہاں عورت اپنی فطری مجبوری سے مصائب جھیلتی ہے۔

گوبندی کا کردار بھی عورتوں کے ایک اہم مسئلہ کو سامنے لاتا ہے۔ یعنی یہ کہ دونوں کے مزاج ملتے نہ ہوں دونوں کا ذوق مختلف ہو، ایک شہرت، فخر ومباہات، دولت وثروت اور عزت ونمود کا دلدادہ ہو تو دوسرا سادگی اور خدمت پر فدا ہو۔ مسٹر کھنا رنڈیوں کے مجرے کراتے، مس مالتی سے ملتے اور عیش پسندانہ زندگی گذارتے اس کے برعکس اعلیٰ درجہ کے بنگلہ، فرنیچر، موٹر اور بے انتہا دولت کے ساتھ رہتے مگر گوبندی" اس کھارے سمندر میں پیاسی پڑی رہتی ہے۔ بچوں کی پرورش دیکھ داخت اور گرہستی کے چھوٹے موٹے کام ہی اس کے لئے۔ سب کچھ ہیں...... اگر مرد اس کا اصلی حسن دیکھنے کیلئے آنکھیں نہیں رکھتا حسینوں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے تو یہ اسکی بدقسمتی ہے، وہ اسی محبت اور اسی لگن سے شوہر کی خدمت کیئے جاتی ہے۔ گویا نفرت ورغبت کے جذبات کو مغلوب کر لیا ہو"[1]

کھنا اور گوبندی کا اصل اختلاف یہ تھا کہ کھنا عیاش تھے۔ کلب میں اور شراب خانے میں وقت گذارتے مگر گوبندی سے نہایت متکبرانہ برتاؤ کرتے اور اس کے جذبات کا کبھی لحاظ نہ کرتے۔ خاص طور سے

---

[1] ص ۳۰۹

مس مالتی کے ساتھ ان کا ربط وضبط رقابت بلکہ سوکن کی منزل تک گوبندی کی نظر میں پہونچ گیا تھا۔ اس کی تصویر پریم چند ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"کھنا اپنے گاہکوں کے ساتھ جتنا میٹھا اور نرم تھا۔ گھر میں اتنا ہی تلخ اور سخت، اکثر غصہ میں گوبندی کو بری بات کہہ بیٹھتا، خوش خلقی اس کے لیے دنیا کو ٹھگنے کا ایک ذریعہ تھی۔ انسانی سرشت نہیں۔ ایسے موقعوں پر گوبندی اپنے سونے کے کمرہ میں جا بیٹھتی اور رات کی رات رو دیا کرتی اور کھنا دیوان خانے میں مجرے سنتا یا کلب میں جاکر شراب کی بوتلیں خالی کرتا لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی کھنا اس کے سب کچھ تھے وہ پامال اور ذلیل ہو کر بھی کھنا کی لونڈی تھی اس سے لڑے گی جلے گی روئے گی مگر رہے گی ان ہی کی۔ ان سے جداگانہ زندگی کا وہ کوئی خیال ہی نہ کرسکتی تھی" (ص ۳۱۰)

یہ ہندوستانی عورت کی وفاداری کی صحیح تصویر ہے۔ مسٹر کھنا کی آوارگی سے اس کی زندگی تلخ تھی مگر اس نے ان کا خیال اور ان کی خدمت میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ پریم چند نے گوبندی کی شاعری کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ غم انگیز نظمیں کہتی تھی، جو اس کی زندگی کی ترجمان ہوتی تھیں۔ مگر کھنا نے کبھی اس کی قدر نہ کی۔ ان معاشرتی اور حقیقی مسائل کو پریم چند نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جو عورتوں کی زندگی کے بنیادی مسائل ہیں۔

عورتوں پر جو مظالم سوسائٹی میں مردوں کی جانب سے روا رکھے جاتے ہیں۔ اس کے خلاف کتاب کے مختلف حصوں میں کافی مواد موجود ہے۔ پریم چند نے مردوں کی زیادتی کا ذکر مختلف کرداروں کی زبان سے کیا ہے۔ یہ سارے کردار عموماً عورتوں کے ہیں۔ دھنیا، سلیا، گوبندی، جھنیا،

مینا کشی اور مہتا کے یہاں معاشرہ کی اس زیادتی کا بیان مؤثر انداز سے ملتا ہے۔ دھنیا اس موقع پر جب ماتادین کے منہ میں ہڈی ڈالی گئی اور اس نے سلیا کو اپنے گھر پناہ دی تب کہتی ہے۔

"میں پنڈت داتادین کی کوئی "دبیل ہوں؟ اس کی آبرو لی برادری سے نکلوایا اور اب کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی ہے کہ کسائی؟ یہ اسی بنیت کا پھل ملا ہے۔ پہلے نہیں سوچ لیا تھا۔ تب تو موج اڑاتے رہے۔ اب کہتے ہیں کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں" (ص ۲۷۱)

ہوری ذرا گھبرائے کہ داتادین اس پناہ دینے پر خفا ہوں گے اس پر دھنیا نے مردوں کی زیادتی کو اور واضح انداز میں بیان کیا۔

"اچھا رہنے دو بڑے نیائی بنے ہو۔ مرد مرد سب ایک ہوتے ہیں۔ اس کو متئی نے بھرسٹ کیا تب تو کسی کو برا نہ لگا اور اب جو متئی بے دھرم ہو گئے تو کیوں برا لگتا ہے؟ کیا سلیا کا دھرم دھرم نہیں؟ رکھنے کو تو چمارن اس پر بڑے نیم دھرم والے بنتے ہیں"۔ (ص ۲۷۱)

ان نسوانی کرداروں میں عورتوں کے مختلف النوع مسائل کی عمدہ تصویر کشی ہے۔ کہیں شوہر کی بے التفاتی کا بیان ہے۔ کہیں اس کی عیاشی اور آوارہ گردی کی شکایت ہے۔ کہیں دونوں کے اختلافِ مذاق کا ذکر ہے کسی جگہ بیوی نہایت گھر گرہست اور سلیقہ شعار دکھائی گئی ہے مگر شوہر نہایت بدکردار کہیں مردوں کی ہوس پرستی اور عورتوں کی فطری مجبوری کا ذکر ہے۔ غرض نسوانی کردار عورتوں سے متعلق معاشرتی مسائل کی

تصویریں پیش کرتے ہیں۔ وہ مسائل جو دیہاتوں اور شہروں دونوں جگہ عورتوں کو پیش آتے ہیں۔

پریم چند نے دو ایک جگہ اس امر کا بھی ذکر کیا ہے کہ اصل مسئلہ عورتوں کا معاشی ہے، اگر معاشی حیثیت سے وہ مردوں پر انحصار نہ کریں اور خود کفیل ہو جائیں تو ان کے مصائب بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔ مس سلطانہ بیرسٹر ہو کر آتی ہے اور خود اپنی روزی کماتی ہے۔ مرزا خورشید کہتے ہیں کہ طوائفوں کا اصل مسئلہ معاشی ہے۔ غرض پریم چند اس مظلوم، ناتواں اور زندگی کے مصائب سے چور طبقہ پر محبت و رحم کی نظر ڈالتے ہیں۔ اور انکے مسائل سے تعرض کرتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے خراب عورتوں کا ذکر کتاب میں کم کیا ہے۔

اس لیئے کہ وہ حقوق نسواں کے ترجمان بن کر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ عملاً خود انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا تھا اور اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اسکو نان نفقہ بھی نہ دیا تھا۔

———(٭)———

ہندی ماحول اور تہذیب

پریم چند نے ہندو مذہبی ماحول پیش کیا ہے۔ مگر یہ وہ تہذیب ہے جو واقعی ہندوستان کی اکثریت کی تہذیب ہے اسلیئے ہم ان کو اس سلسلہ میں الزام نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ان تمام باتوں کے بعد ہندو مذہب کی بعض غلط باتوں کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ ماتا دین کو جب کاشی کے برہمنوں نے دوبارہ برہمن بنا دیا اور اس کو گئو مُترا اور گئو گوبر کھلا کر پاک کر دیا تو اس پر پریم چند اس طرح طنز کرتے ہیں " لیکن اس طرح پراسچت نے اُسے سچ مچ پوتر کر دیا۔ ہوم کے جلتے ہوئے کنڈ میں اس کی بشریت نکھر گئی اور ہوم کے شعلوں کی روشنی میں اس نے مذہبی ارکان کو اچھی طرح پرکھ لیا۔ اس دن سے اُسے دھرم کے نام سے چڑھ ہو گئی۔ اس نے جنیو اُتار کر پھینک دیا اور پروہتی کو گنگا میں ڈبو دیا۔ اب وہ پکا کسان تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ علماء نے اس کا برہمن ہونا تسلیم کر لیا، لیکن لوگ اب بھی اس کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے۔ اس سے مہورت پوچھتے ہیں۔ ساعت اور لگن کا بچار کراتے ہیں۔ اسے تیوہار کے موقعوں پر دان دکشنا دیتے ہیں۔ مگر اپنے برتن انہیں چھونے دیتے"۔

ماتا دین کے علاوہ پروفیسر مہتا کے کردار میں بھی مذہب پر طنز ہے مہتا کہتے ہیں کہ یہ مکتی بھگتی کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آدمی کا عمل اور انسان کی خوشی اصل حیات ہے۔ میں نے مہتا کے ذکر میں

نوع پر کافی بحث کی ہے۔ ان اُمور سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی
پریم چند نے ہندوستانی معاشرے کی حقیقت پسندانہ تصویریں
کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اکثر اپنے موروثی جذبات کے ہاتھوں
جاتے ہیں۔ ان کا مقصد زندگی کے کثیر الوقوع حالات، واقعات اور
ت کی ترجمانی تھا۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے
ندگی کا پورا خاکہ بھی پیش کیا ہے جو ہندوستانی شہروں اور دیہاتوں
نظر آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شہروں کی زندگی اچٹتی تصویروں
ی ہے مگر دیہاتی زندگی جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔
کہ دیہاتی ہندو معاشرہ میں مذہب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔
اس معاشرہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے
جن کے کردار میں دکھائی گئی ہے۔

پریم چند نے اس ناول میں ہندو تہذیب، کلچر، انداز و اطوار،
ن اور گائے پرستی کی ترجمانی کی ہے۔ صرف مواد ہی نہیں بلکہ زبان
ی استعمال کی ہے۔ حتیٰ کہ کتاب کا نام تک خالص ہندو مذہب
یب کی غمازی کرتا ہے۔ یہ ناول پوری طرح ہندو تہذیب میں
ا ہے۔ اس میں وہ ماحول موجود نہیں جو اردو زبان کا ماحول
ہے۔ اس میں پریم چند نے اردو اور ہندی دونوں الفاظ سے ایک
ن ایجاد کی ہے۔

اب ذیل میں اس طرز کی عبارتیں بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔
ں: "نیچ جات پیٹ بھر روٹی کھائی اور ٹیڑھے چلے، اسی سے شاستروں

میں کہا ہے کہ نیچ ذات لنتیائے بھلا" (ص ۲۰۷)

"ماتا دین کو کئی سو روپیہ خرچ کرنے کے بعد آخر میں کاشی کے پنڈتوں نے پھر برہمن بنا دیا۔ اس روز بڑا بھاری ہوم ہوا۔ بہت سے برہمنوں نے کھانا کھایا اور بہت سے منتر اور اشلوک پڑھے گئے۔ ماتا دین کو شدھ گوبر اور گئو موتر کھانا پینا پڑا۔ گوبر سے اس کا دل پاک ہو گیا اور گئو موتر سے اسکی روح کے ناپاک جراثیم ہلاک ہو گئے" (ص ۵۶۴)

"پنڈت نوکھے رام بڑے اعلیٰ درجہ کے برہمن تھے ان کے دادا کسی راجہ کے دیوان تھے مگر اپنا سب کچھ بھگوان کے چرنوں پر چڑھا کر سادھو ہو گئے تھے۔ ان کے باپ نے بھی رام نام کی بھگتی میں زندگی کاٹ دی تھی۔ نوکھے رام نے بھی وہی بھگتی ترکہ میں پائی تھی۔ علی الصبح پوجا پاٹ پر بیٹھ جاتے تھے اور دس بجے دن تک بیٹھے ہوئے رام نام جپا کرتے (ص ۲۰۸)

اِن عبادتوں میں ہندو ماحول پورے آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ الفاظ بھی ہندی اور انداز تعبیر بھی ہندی۔

"کھنا اور گوبندی میں نہیں پٹتی۔ کیوں نہیں پٹتی؟ یہ بتلانا مشکل ہے۔ نجوم کے نقطۂ خیال سے ان کے ستاروں میں کوئی مخالفت نہیں حالانکہ شادی کے وقت ان سب کی پوری مطابقت کر لی گئی تھی۔ کوک شاستر کے حساب سے اِس ان بن کا کوئی اور بھید ہو سکتا ہے" (ص ۳۰۸)

"ہوری بھگتی بھری نگاہوں سے گائے کو دیکھ رہا تھا جیسے ساچھات (مجسم) دیوی جی نے گھر میں قدم رکھا ہو۔ آج بھگوان نے یہ دن دکھایا کہ اس کا گھر گئو ماتا کے چرنوں سے پوتر ہو گیا۔ ایسے اچھے بھاگ نہ جانے کس کے بیٹے کا

پھل ہیں (ص ۵۹)

"ہولی کے ایک ماہ قبل سے پھاگ ہو رہا تھا۔ اساڑھ لگتے ہی آلھا شروع ہوجاتا ہے اور ساون بھادوں میں کجلیاں ہوتی ہیں کجلیوں کے بعد رامائن شروع ہوجاتی ہے۔ سمری بھی ان مشاغل سے مستثنیٰ نہیں (ص ۳۵۸)

یہ سب کیفیات ہندو سماج کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان میں مذہبی رسومات معتقدات اور مشغولیات کی مکمل و مفصل تصویریں ہیں۔" اگر برہمہ تیج ہوتا تو اُن دشٹوں کو بھسم کردیتے۔ ایسا سراپ دیتے کہ سب کے سب وہیں بھسم ہوجاتے۔ مگر اس کلجگ میں تو سراپ کا اثر ہی جاتا رہا (ص ۳۵۸)

مگر دونوں گویا چھتیس ۳۶ کا ہندی عدد (३६) بنے ہوئے تھے۔

(ص ۳۴۳)

"نوکھے رام اگر ایکادشی کو برت رکھتے ہیں اور پانچ برہمنوں کو کھلاتے ہیں تو چنتیواری ہر پورنماسی کو ست نرائن کی کتھا سنیں گے اور دس برہمن کھلائیں گے۔

(ص ۳۵۴)

چونکہ پریم چند نے ہندو تہذیب کی ترجمانی کو اپنا مقصد بنایا تھا۔ اگر وہ یہ ترجمانی اردو الفاظ، اردو انداز تعبیر اور اردو ماحول کے ذریعہ کرتے تو شاید وہ اتنی صحیح تصویریں پیش نہ کر پاتے اور نہ وہ ہندو ماحول کو اس کی اصل شکل میں نمایاں کر سکتے۔ انھوں نے ہندوؤں کے مذہبی سماجی اور تہذیبی ماحول کو پوری طرح مصور کیا ہے۔ ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ ہندی انداز تشبیہ پیش کیا ہے اور ہندی ماحول کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

اُردو میں گئودان کی حیثیت

پریم چند نے جس زمانے میں گئودان تصنیف کی اس وقت انکی زبان عوام سے قریب تر ہو گئی تھی۔ اس میں عوامی اندازِ بیان، طرزِ تعبیر، مثال و محاورے اور عوامی الفاظ پوری طرح ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس عوامی زبان میں اردو اور ہندی دونوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ زبان تو ایک ہی ہے۔ صرف الفاظ کی تبدیلی سے ہندی یا اُردو کہی جاتی ہے۔ ایسی مماثل اور متشابہہ زبانوں کے بارے میں اختلافِ نظر پیدا ہونا ضروری ہے۔ گئودان کی زبان میں کچھ حِصّے ایسے نظر آتے ہیں جو گئودان اور گودان کو بالکل الگ کر دیتے ہیں۔ یہ حصے ایسے ادبی ہوتے ہیں کہ اردو والوں کو ہندی عبارت سمجھنی مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہندی والوں کو اُردو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس گئودان کے وہ حِصّے جو آسان زبان میں ہیں۔ ان میں گئودان اور گودان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ زبان اور وہ مکالمے جو دیہاتی کرداروں کے ذریعہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں جو دیہاتی زبان استعمال ہوئی ہے۔ وہ اُردو اور ہندی دونوں میں یکساں ہے۔ علاوہ ازیں پریم چند کے یہاں تشبیہات اور استعارے کے استعمال میں فارسی انداز نظر سے ہٹ کر ہندی طرز اختیار کیا گیا ہے۔ یہ تشبیہیں عوامی زندگی سے مستعار ہیں اور ان میں ہندوستانی سماج کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کا اُردو میں استعمال اسی طرح ہے۔ جس طرح اُن کو

ہندی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ان حقائق کی بنا پر میرا نظریہ یہ ہے کہ گئو دان کی زبان اگرچہ اقبال سحر ورما ہنگامی کی ہے۔ مگر وہ نہ ممتاز ادیب تھے اور نہ شاعر۔ نہ اردو ادب میں انھوں نے کوئی امتیاز و افتخار حاصل کیا۔ اگر پریم چند کے سلسلہ میں ان کا نام نہ آجاتا تو کوئی ان کو نہ جانتا۔ اب سوال یہ ہے کہ گئو دان کی زبان میں جو خوبیاں ہیں ان کو اقبال سحر ورما کی طرف منسوب کیا جائے یا پریم چند کی طرف۔ مندرجۂ ذیل دلائل کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ پریم چند کی کتابوں کے اردو ترجمہ کی زبان کی عظمت مترجم کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مصنف ہی کا فیض ہے۔ اسی بنا پر پریم چند نے اپنے کسی ناول یا افسانہ میں مترجم کا نام درج نہیں کیا؛ کیا عمداً انھوں نے خیانت کی ہے؟

۱۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اردو۔ ہندی آپس میں حد درجہ یکسانیت رکھتی ہیں۔ آسان اردو اور آسان ہندی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ پھر قواعد بھی دونوں کی یکساں ہے۔ فرق صرف الفاظ کا ہے۔

۲۔ پریم چند عمداً ایسی زبان لکھتے ہیں جو ہندوستانی ہوتی ہے۔ خصوصاً گئو دان کی زبان عوام سے قریب تر ہے۔ سوا مہتا اور مالتی کے اعلیٰ خیالات کے باقی حصے دونوں زبانوں میں یکساں آسان ہیں اور زبان کا فرق کم سے کم تر ہے۔

۳۔ دیہاتی زبان دونوں میں یکساں ہے۔ کہیں کہیں ہلکی سی تبدیلی ملتی ہے۔ یہ حصّہ گئو دان میں خاصہ اہم ہے اور لگ بھگ کتاب کا دسواں حصّہ ہے۔

۴۔ تشبیہات، امثال اور محاورے دونوں میں اکثر یکساں ہیں۔

ان کو ہندی بھی کہا جاسکتا ہے اور اردو بھی۔

۵۔ گئو دان میں استعمال ہونے والی متشابہہ و مشترک زبان خواہ ہندی میں لکھی جائے یا اردو میں وہ کسی ایک زبان کا سرمایہ قرار نہیں پاسکتی۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت فارسی رسم الخط میں لکھی لیکن چونکہ زبان اودھی تھی وہ ہندی ادب میں شامل ہوگئی نہ کہ اردو میں۔ اسی طرح گئو دان اگرچہ ہندی میں لکھی گئی مگر اس کی زبان اردو سے اتنی قریب تر تھی کہ درمیانے معمولی تبدیلیاں کرکے اسکو اردو ادب میں شامل کر دیا۔ جس پر خود مصنف نے نظر ثانی کی تھی۔

۶۔ اس طرح گئو دان کی زبان کی خوبیوں کا مرجع پریم چند کی ذات ہے نہ کہ مترجم ورما کی شخصیت۔

۷۔ آج تک کسی معمولی و مترجم کی کتاب زبان کے لحاظ سے اس انفرادیت اور عظمت کو حاصل نہیں کرسکی جو گئو دان کو حاصل ہے؛

۸۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کی نسبت اہل علم کے خیالات کا مطالعہ فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ادبی زبان کا صحیح ترجمہ دوسری زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بنا پر مولانا آزاد نے غبار خاطر کا ترجمہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کے برعکس اس امر پر غور کیجئے کہ پریم چند کی زبان کا ترجمہ اردو میں ہوا اور اس کو ادبی عظمت و انفرادیت اس بلندی کے ساتھ حاصل ہوگئی کہ آج پوری اردو نثر میں ان کی عظمت ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے حالانکہ انکے اکثر ناول اردو میں ترجمہ کی حیثیت رکھتے ہیں

۹۔ سوال یہ ہے کہ کیا اردو میں ہزاروں مترجم کتابوں کے ذخیرہ میں

کسی کتاب کی زبان اس عظمت کی حامل ہے جو ہم کو گئودان میں نظر آتی ہے۔ گئودان کی زبان اتنی ممتاز و منفرد ہے کہ اردو میں وہ ایک نئے افق کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایک نئے مکتبِ فکر کا آغاز کرتی ہے اور اردو کے اسالیب بیان میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کرتی ہے ایک ایسا اسلوب جو عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے قریب تر ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کے مترجم ورما اردو اسلوب میں کسی امتیاز کے حامل نہیں۔ اگر زبان و بیان کی خوبی اسکی طرف منسوب کی جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا پوری عمر میں انھوں نے اس طرز کی (اپنی آزاد) زبان کبھی بھی پیش کی ہے۔ اس کی زبان کے جو نمونے اس کی خودنوشت سے پروفیسر مسعود حسین خاں نے پیش کیئے ہیں۔ ان میں پریم چندی اسلوب کا کہیں دور و نزدیک پتہ نہیں چلتا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مترجم نے جہاں کہیں پریم چند کے گئودان سے انحراف کیا ہے وہاں غلط زبان اور غلط محاورے گئودان میں استعمال کر دیئے ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ گئودان کو اردو میں کیا درجہ دیا جائے؛ ترجمہ کا یا تصنیف کا؛ چونکہ باوجود ترجمہ کے اس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا منبع مصنف ہے جس کی زبان کا بڑا حصہ من و عن ہندی سے اردو میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس لیئے میں اسکو اردو اسلوب بیان میں ایک اضافہ کی حیثیت دینے میں قباحت محسوس نہیں کرتا۔ اگر یہ آج کل کی سخت ہندی میں ہوتی اور پریم چند کی اصل زبان اردو میں بالکل بدل جاتی مگر ان کی آسان ہندی جب اردو کا قالب اختیار کرتی ہے تو مصنف کے اسلوب کی جملہ خصوصیات بھی اردو میں اپنے ساتھ لاتی ہے مع تقریباً انھیں الفاظ اور انداز تعبیر کے ساتھ۔

اس بنا پر دوسری زبانوں کے ترجموں سے اس طرز کے ترجمہ کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ صرف پروفیسر مہتہ کے اعلیٰ خیالات کا حصّہ بے شک شُدھ ہندی میں ہے اور وہ حصّہ اُردو ہندی میں ایک دوسرے سے متغایر ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو میں کتاب کا بڑا حصّہ وہی ہے جو ہندی میں ہے

محترم ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق بالکل صحیح ہے انھوں نے دلائل قاطعہ سے ثابت کر دیا ہے کہ گئودان ہندی گئودان کا ترجمہ ہے۔

چونکہ اردو میں گئودان پہلے ہی سے ادبی عظمت حاصل کر چکی ہے اسلئے میں اس قبضہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوں اور میں نے اس بارے میں اپنے دلائل لکھ دیئے ہیں۔ خصوصًا اس دور میں جبکہ دکنی جو خالص اُردو ہے اس پر۔ دوسری زبان والے قبضہ کر رہے ہیں میں مناسب تصور نہیں کرتا جو کتاب خود مصنف نے اُردو کو دی ہے اور ترجمہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے اسکو کیوں واپس کر دیا جائے لہذا اس کی زبان اور بیان کی ندرت کے باعث اس کو تصنیف کا درجہ اردو میں حاصل ہے اور یہ نقطۂ نظر میں نے پریم چند کی .... آسان ہندی کے باعث اختیار کیا ہے کہ ہندی کا یہ پہلا مصنف ہے جو ہندی میں کثرت سے اردو، فارسی الفاظ استعمال کرتا ہے اور اردو سے ہندی کی طرف گیا ہے تو دراصل یہ ہمارا سرمایہ ہے جو ہماری طرف واپس آگیا ہے۔

ہندی اور اُردو میں زبان کا فرق مندرجۂ اقتباسات میں ملاحظہ فرمایئے:۔

گئودان (ہندی)

ہیرا نے روتے ہوئے کہا بھابھی دل کڑا کرو۔ گئودان کرا دو۔ دادا چلے۔

دھنیا نے اسکی اور ترسکار کی آنکھوں سے دیکھا۔ اب وہ دل کو اور کتنا کڑا کرے۔ اپنے پتی کے پرتی اس کا جو دھرم تھا کیا وہ اس کو بتانا پڑے گا۔ جو جوانی کا سنگی تھا اس کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے۔

دھنیا ینتر کی بھانت اٹھی۔ آج جو سنتلی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور پتی کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے داتا دین سے بولی۔ مہراج گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا۔ نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں اور یہی ان کا گئودان ہے۔ اور پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

گئودان (اردو)

ہیرا نے روتے ہوئے کہا بھابھی دل کڑا کرو۔ گئودان کرا دو ——

دھنیا نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا۔ اب وہ دل کو اور کتنا کڑا کرے؟ اپنے شوہر کے ساتھ جو اس کا دھرم ہے کیا یہ اس کو بتانا پڑیگا جو زندگی کا ساتھی تھا۔ اس کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے۔

دھنیا مشین کی طرح اٹھی۔ آج جو سنتلی بیچی تھی۔ اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ پر رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی مہراج، گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں یہی انکا گئودان ہے اور غش کھا کر گر پڑی۔

میرا یقین ہے کہ کتاب کا بڑا حصہ اسی انداز کا ہے اور ہندی وار دو میں جملوں کی ابتداء اور انتہا یکساں ہے۔ فرق صرف الفاظ کا ہے، اصطلاحوں کا ہے، جو اکثر معمولی ہے۔ مگر کہیں ادبی زبان کے باعث فرق زیادہ ہو گیا ہے۔ اِس بناء پر میں گئو دان کو اُردو میں بحیثیت اسلوب اور بحیثیت مواد اہم تصوّر کرتا ہوں۔ اس لیے کہ دراصل آسان اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس کا اندازہ مذکورۂ بالا اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ گئو دان کی یہ حیثیت جو اسے اس وقت اردو ادب میں حاصل ہے مستقبل میں بھی قائم رہے گی۔

دراصل سب سے پہلے یہ مسئلہ طے ہونا چاہیے کہ اگر مصنف خود اپنی کتابوں کو دو زبانوں میں پیش کرے تو ان کی حیثیت کیا ہوگی؛ اسلیے کہ موجودہ صورت میں پریم چند کی کتابیں اردو اور ہندی میں یکساں مقبول ہیں اور ان کی تصانیف تصوّر کی جاتی ہیں اگر ان کو ترجمہ سمجھا جائے تو پھر ان کی کئی تصانیف اردو سے نکل جائیں گی اور بعض ہندی سے خارج کرنی پڑیں گی۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس عمل سے کوئی بڑا نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اِس لیے کہ زبان کی یکسانیت اور خود مصنف کی نظر ثانی۔ اس راہ میں مانع ہے۔

گئودان کی زبان

کتاب میں ادبی نقطۂ نظر سے مختلف حصے مختلف معیار کے ہیں۔ کہیں ادبیت اپنی پوری رعنائی و رنگینی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور کہیں عبارت میں محض سادگی و صفائی نظر آتی ہے۔ جیسے ندی کبھی چڑھتی ہے اور کبھی اترتی ہے، مگر اس کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ دیہاتی زندگی کے بیان میں نظرت کے چشمے رواں نظر آتے ہیں مگر شہری زندگی میں مہتا کی شکل میں فلسفیانہ خیالات ممزوج ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس طرز کے چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں، جہاں زندگی اپنے پورے شباب کے ساتھ موجزن نظر آتی ہے۔ جہاں فکر کا ارتقاء زبان کو گل و گلزار بنا دیتا ہے، جہاں تصور کی خوشگواری دل کو نشاط کی شبنم سے آشنا کرتی ہے اور جہاں زندگی کی تصویریں زبان کی چاندنی میں مصفی اور مجسم نظر آتی ہیں اور سماجی مسائل حسن بیان کے چمن زار سے اس طرح چھن چھن کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جیسے چاندنی رات میں درختوں کے پتوں سے مہ کا ظہور ہو۔

پریم چند کی زبان میں ایک خاص طرز کی عوامیت ہے، ان کی تشبیہوں میں حقیقت کا جلوہ ہے ان کے الفاظ میں عوام کی زبان مصور ہے۔ ان کی ترکیبوں میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ جہاں وہ غیر معمولی ادبی عبارت لکھتے ہیں، وہاں وہ فارسی انداز کی تشبیہہ اور زبان استعمال کرتے ہیں مثلاً:۔

"مہتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا' آتی ہو بار بار آتی ہو۔ خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح' تصور کے ایک عکس کی طرح اور پھر غائب ہو جاتی ہو دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور تم ہوا ہو جاتی ہو"

(ص ۵۱۲)

یہاں اسلوب میں جو کیفیت ہے وہ عام ادبی کیفیت سے بلند ہے۔ وہ اکثر حسن تشبیہ کے ذریعہ عبارت کو پُر بہار بناتے ہیں مثلاً:۔

"دوسروں کی تکلیف دور کرنے میں اس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و آرام کی زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس اب ان پھولوں کی طرح کمزور ہو گئی تھی جن میں پھل لگ رہے ہوں" (ص ۵۵۷)

یہاں جو تشبیہ ہے وہ نہایت حقیقی اور دلکش ہے مگر تخیل اس سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔ مہتا کے جذبات مالتی کے بارے میں ملاحظہ ہوں:۔

"اندر کی خواہشیں باہر آ کر گویا سبیج ہو گئی تھیں اس کا رواں رواں پھول اٹھا۔ جس سمر دتہ کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابل حصول اور اتنا قریب ہے اور دل کا وہ سرور چہرے پر آ کر اسے ایسی رونق دینے لگا کہ مہتا کو اس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم مورت" (ص ۵۵۶)

یہ عبارتیں ان کے عام اسلوب بیان سے بلند ہیں ان میں ادبی چاشنی عموماً حسن تشبیہ سے عبارت ہے مگر یہ تشبیہیں اردو مزاج سے مختلف ہیں۔ ان میں ہندوستانی انداز فکر کا جلوہ ہے۔ ان میں حقیقت کی روح ہے۔ ان میں سچائی تخیل پر غالب ہے اور ان میں معاشرت کی تصویریں اور

دلکش جذبات متموج نظر آتے ہیں۔

پریم چند کی زبان میں نشیب و فراز ہے کہیں موضوع کے لحاظ سے بہت بلند خیالات کی ترجمانی ہے۔ کہیں بالکل عوامی احساسات کی جلوہ گری ہے۔ کہیں واقعات کا بیان ہے اور کہیں ماضی کی یاد میں حقیقت کے جلوے کرداروں کی زبان سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

"ہوری کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ دھنیا کی یہ نسوانی محبت اس تاریکی میں بھی گویا چراغ کی طرح اس کی فکرمند صورت کو منور کر رہی تھی۔ دونوں کے دل میں گویا گذرا ہوا شباب جاگ اٹھا تھا۔ ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو پچیس سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اس گلے لگنے میں کتنا اتحاد پریم تھا۔"

اس اقتباس میں مصنفؒ نے حسنِ بیان کی جانب خاص توجہ کی ہے۔ ماضی کے دھندلکے میں ان حسین یادوں کو تلاش کیا ہے۔ جو جوانی سے وابستہ ہیں۔ ایسے مواقع پر ان کا قلم پھول برساتا ہے۔ وہ ان مواقع پر اپنی ہندیت سے بھی دور ہو جاتے ہیں اور خاص اردو کے الفاظ سے حسن و نور کی دنیا بساتے ہیں۔

اب ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو جو حسنِ خیال اور بلندیٔ نظر کا حامل ہے۔

"مالتی انسانیت کے اس بلند معیار پر پہونچ گئی تھی جہاں نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں عقیدت کی چیز تھی۔ اب وہ نایاب ہوگئی تھی اور ایسا ہونا فہم و فراست والوں کیلئے سعی دکوشش کرنے کا ایک منتر ہے۔ مہتا عشق میں جس خوشی کا تصور کر رہے تھے اسے عقیدت نے اور بھی گہرائی اور جانداری دے دی تھی۔

عشق میں کچھ گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور کچھ لگاؤ بھی مگر عقیدت تو خود کو فنا کر دیتی ہے۔ (ص ۵۵۹)

یہاں پریم چند تخیل کی بلندی پیش کرتے ہیں وہ نفسیات کے ماہر ہیں آخری جملہ میں کس طرح عشق کا غرور بیان کرتے ہیں اور عقیدت میں تو آدمی اپنے کو دوسرے کے حوالہ کر دینا چاہتا ہے مگر در اصل عشق میں بھی یہی کیفیت ہے، البتہ حسن مغرور ہوتا ہے۔ پریم چند سے ایسے تسامحات اکثر سرزد ہو گئے ہیں۔ حسن بے وفا، مغرور اور فانی ہوتا ہے مگر عشق میں خاکساری وفاداری اور سپردگی کی کیفیت ہوتی ہے اور یہی عالم عقیدت کا بھی ہے۔ زبان بھی اس جگہ فلسفیانہ سی ہے۔

عورت کے حسنِ تخیل کے بارے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اس کے منہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اسکا دل بچے کی تازگی سے بھر جاتا تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور میٹھے سپنے دیکھتی اور نئی نئی دنیا بساتی جس کا راجا رامو ہوتا" (ص ۵۶۹)

"یہاں پریم چند نے عورت کی نفسیات اور نئی ہستی سے اس کی امیدوں اور آرزوؤں کی عمدہ تصویر پیش کی ہے زبان بھی دلکش استعمال کی گئی ہے"۔

ناول کے ایسے حصے بڑے موثر ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کی کیفیت بیان کرتے ہیں:۔ "بچہ نیلے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا ہمک رہا تھا۔ زندگی کی اس خوشی کے ساتھ جو ابھی اس میں تازہ تھی" (۵۶۹)

ان کا تجربہ اور مشاہدہ اس طرح ان کی زبان کو حسن کے جادو سے بھر دیتا ہے۔ کہ آدمی اس سے تاثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً یہ باتیں

جس پس منظر میں کہی گئی ہیں، ان میں ان سے زیادہ دلکش اور انسانی جذبات و کیفیات نفس کی ترجمانی ممکن نہ تھی۔

گوبندی کی شاعری کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں :-

"اس کی نظم صرف دل کی لہر اور تخیل کی اڑان نہ تھی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی زندگی کا درد اور اس کے آنسوؤں کی ٹھنڈی جلن بھری ہوئی تھی۔ کسی ایسی جگہ جا بسنے کی خواہش تھی، وہ ظاہرداریوں اور رغبتوں سے دور رہ کر اپنی پرسکون کٹی میں قدرتی مسرت کا لطف اٹھائے" (ص۔ ۲۱)

چونکہ گوبندی کے شوہر کھنّا کی زندگی عیش پرستی، ظاہرداری، دنیاداری اور عیش و عشرت کی تھی جس کو وہ ناپسند کرتی تھی، جلتی تھی۔ وہ اپنی نظموں میں اظہار غم سے اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔ یہاں حسنِ بیان بھی قابلِ لحاظ ہے۔

مہتا مسٹر کھنّا سے ان کے مِل کے جل جانے کے بعد کہتے ہیں :-

"کھنّا جی ذرا صبر سے کام لیجئے، آپ سمجھدار ہو کر دل اتنا چھوٹا کرتے ہیں، دولت سے آدمی کو جو وقار ملتا ہے وہ اس کا وقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا وقار ہے۔ آپ مفلس رہ کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور دشمنوں کے بھی۔ بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن نہ رہے گا" (ص ۴۷۹)

اس طرح کے اعلیٰ خیالات مہتا، مالتی اور گوبندی کے مکالموں میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ان میں پریم چند کے فکری ارتقا کی عظمت محسوس ہوتی ہے اور انھیں عبارتوں میں ان کی زبان بھی حکیمانہ قالب اختیار کر لیتی ہے۔

گو بندی کھنّا سے مِل جلنے کے بعد کہتی ہے:-

"میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے۔ خود غرضی اور انسان کے پیٹ تلے نہیں۔ زندگی کا سکھ، دوسروں کو سکھی رکھنے میں ہے۔ انھیں لوٹنے میں نہیں۔ بُرا نہ ماننا۔ اب تک تمہاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش کوشی۔ ایشور نے تمہیں اِن ذرائع سے محروم کر کے تمہارے لیئے زندہ بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے ....

میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے، دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اِتنا جلد بھول گئے؟"

گو بندی کے خیالات بھی نہایت اعلیٰ ہیں۔ پریم چند نے نسوانی کرداروں میں گو بندی کو بہت بلند دکھایا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو نہایت عمدہ نصیحت کرتی ہے۔ پریم چند نے اس قسم کے مکالموں میں حسنِ زبان کا لحاظ رکھا ہے۔ جہاں وہ بلند خیالی پیش کرتے ہیں زبان کا لب و لہجہ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسے مواقع پر اردو ماحول غالب ہو جاتا ہے۔

پریم چند کی زبان پر ہندیت اور دیہاتیت کی چھاپ لگی ہے۔ اس کو ہم ہندوستانیت اور عوامیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں مگر ناول کے بہت سے حصّے ایسے ہیں جو نہایت عمدہ ادبی اُردو میں

پیش کئے ہیں۔ جن میں حسنِ تخیل، تشبیہہ و استعارہ اور حقائق کے جلوے اس طرح بکھرے ہیں جیسے ستارے تاروں بھری رات میں آسمان پر بکھرے ہوں۔

مندرجہ بالا عبارتوں میں مصنف نے زبان و بیان کے لحاظ سے دلکش انداز پیش کیا ہے۔ ان کی زبان حالات، واقعات، موضوع، اشخاص اور مواقع کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کہیں بالکل دیہاتی ہو جاتی ہے، کہیں بالکل شہری، کہیں بہت شیریں اور فصیح، کہیں بالکل فلسفیانہ اور کبھی تشبیہہ و استعارہ سے پر تو کبھی نفسیاتی گتھیوں پر مشتمل ہوتی ہے

کتاب کا ایک خاصہ بڑا حصّہ دیہاتی ہے۔ کچھ حصّہ بلندی خیالات سے تعلق رکھتا ہے اور ایک اہم حصّہ کسانوں کے مسائل اور معاشرت پر مشتمل ہے۔ مگر ان میں سے ہر حصّہ کی زبان مختلف ہے۔ بلندی اور پستی، نشیب اور فراز زبان میں کچھ اس طرح ملتا ہے جیسے گلاب کے پھول میں یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے۔

پریم چند کے اسلوب کا تدریجی ارتقاء

پریم چند کا اسلوب مخصوص امتیازات کا حامل ہے۔ اس میں چند امور قابل غور ہیں۔ دورِ جدید میں پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ایک سیدھا اور دلکش اسلوب استعمال کر کے نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے اور افسانوی ادب میں ایک صالح قدر کا اضافہ کیا ہے۔ اُردو کے وہ ناقد جو پریم چند کی ناول نگاری کے زیادہ قائل نہیں وہ بھی ان کی زبان کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ ان کا طرز بیان، ان کی شخصیت کی طرح سادگی کا ترجمان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلوب خود انسان کی ذات ہے۔ پریم چند پر یہ کیفیت زیادہ واضح ہے۔ سادگی، صفائی، بے ساختگی اور شگفتگی ان کی تحریر کی روشن صفات ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دریا کی سی روانی ہے۔ اس میں ذہن کو غذا اور جذبات کو گرمی عطا ہوتی ہے۔ انھوں نے تدریجی طور پر اپنے مخصوص اسلوب کو جنم دیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے ان کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی ہے کہ "ان کی نثر رواں، وقیع اور مستحکم ہے۔ ان کا طرز تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے"۔

پریم چند کے اسلوب کے ارتقاء اور پختگی کے مراحل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں ادوار میں ان کی زبان مختلف ترقی کے منازل طے کرتی نظر آتی ہے۔ جو گودان پہ پہونچ کر "پریم چندی بھاشا" بن کر معراج کمال تک پہونچ جاتی ہے۔ وہ

ادوار معہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

دورِ اوّل:۔ اس دور میں انھوں نے ہم خرما و ہم ثواب، جلوہ ایثار، سوزِ وطن اور بیوہ لکھا۔ ان کتابوں میں ان کی زبان ناپختہ ہے۔ محاورہ کی غلطیاں، عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ، فارسی ترکیبیں اور دقیق اور نامانوس الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ اس دور میں وہ مولانا محمد حسین آزاد کی آتش زبانی اور فصاحت سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔

پریم چند نے سرشار کی زبان اپنانے کی بھی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسکی وجہ دونوں فن کاروں کے موضوع کا اختلاف ہے۔ سرشار نواب اور مصاحبین کے بارے میں داستان سرائی کرتے ہیں، مگر پریم چند کا موضوع متوسط ہندو طبقہ اس کی زندگی اور اس کے مسائل تھے اسلیئے ان کی زبان میں سرشار کی با محاورہ زبان کی تقلید دشوار تھی۔ اس بنا پر وہ تقلید میں کامیاب نہ ہو سکے اور یہ اچھا ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ دونوں ادیبوں کا مقصد معاشرتی زندگی کا بیان تھا۔ فرق صرف طبقات اور ماحول کا تھا۔ پریم چند نے اس دور میں آزاد اور سرشار سے اسلوب میں کسب فیض کیا تو دوسری جانب معنوی طور پر انھوں نے ٹالسٹائی اور ٹیگور کے خیالات و انداز سے اثر قبول کیا، مگر یہ ان کے ذہن و اسلوب دونوں کا تعمیری دور تھا اسلیئے کچھ کچا پن ظاہر ہونا ضروری تھا۔

۱؎ تقسیم ادوار کی پوری بحث کا مرجع "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔

دوسرا دور:--- اس دور کے کارناموں میں بازارِ حسن، گوشۂ عافیت اور نرملا ناول شامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور سے ان کے یہاں پختگی اور حسن کے آثار نمایاں ہیں۔ بازارِ حسن میں پہلی بار ان کا اپنا انداز و اسلوب واضح ہوا ہے۔ بلکہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس کو ان کا شاہکار ناول قرار دیتے ہیں۔ نرملا میں ان کے اسلوب کی انفرادیت بہت بڑھ گئی ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصنف ایک مخصوص اسلوب کا حامل ہے۔

اس دور میں ان کے یہاں روزمرہ، ضرب الامثال اور معاشرتی محاوروں کا دلکش استعمال ملتا ہے۔ ان کی عبارتیں زیادہ شیریں اور آسان ہونے لگتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلوب کا امتیاز یہ بھی قرار دیا ہے کہ اس میں بول چال کے الفاظ اور اندازِ تعبیر کو کثرت سے پیش کیا ہے۔ اس سے ان کا مقصد عوام کی زبان و معاشرت سے قربت اور ان کی زندگی کی صحیح ترجمانی ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ وہ تشبیہ و استعارہ، تلمیح اور رنگین بیانی اور پر تکلف عبارتوں سے قاری کو مرعوب یا متاثر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے بے تکلف محاورے اور عام تشبیہیں ہمیشہ دیہاتی زندگی اور کسانوں کے مشاغل سے مستعار و مستفاد ہوتی ہیں۔

یہاں اس طرز کی چند مثالیں پیش ہیں:-

۱- نرمل بائی کا کرا اینٹ پتھر نہیں، لاکھ کا تھا جو ایک ہی آنچ میں پگھل جاتا تھا۔

۲- کل کا بنیا آج کا سیٹھ۔

۳- مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال۔

۴- چھاتی پر مونگ دلنا ۵- سینہ پر سانپ لوٹنا۔

البتہ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ پریم چند کے یہاں ہندی الفاظ کا استعمال اور اسکے محاورے اور اس کا انداز تعبیر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اُردو داں طبقہ کو ان کی زبان میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ اِس دور میں ان کے یہاں اس طرز کے نامانوس الفاظ ملتے ہیں۔

۱۔ شسست اپرادھ ۲۔ انیائے ۳۔ پرلوک

۴۔ سورگیاش ۵۔ ادرستکار

تیسرا دور:۔ اس دور میں انھوں نے چوگان ہستی، پردہ مجاز، میدان عمل اور گئودان جیسے ناول لکھے جن میں زبان و فکر دونوں میں پختگی، متانت اور عظمت نمایاں ہے۔ عوامی معاشرت سے قربت کا جو عمل پریم چند نے دوسرے دور میں اختیار کیا تھا اب تیسرا دور اس کا معراج کمال معلوم ہوتا ہے۔ پریم چند نے اپنی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا۔ اس دور میں صرف رسم الخط کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ورنہ ان کی ہندی اور ان کی اردو دونوں کے اکثر حصے یکساں ہیں۔ ان کی زبان کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ اور جملوں میں اشخاص، واقعات اور مناظر کے جیتے جاگتے مرقع پیش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سبک جملوں میں شہد کی مٹھاس اور پھولوں کی رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ جو دل کو موہ لیتی ہے۔ اِن کی ایسی عبارتوں میں ایک روانی اور موسیقیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فصاحت کا اعلیٰ معیار ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ پریم چند پہلے اُردو کے ادیب تھے۔ جو بہت جلد اردو سے ہندی کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس انتقال نے

ان کے تصور اور ان کی زبان کو بھی بدل دیا اور تیسرے دور میں ان کی زبان کے عربی و فارسی الفاظ کم سے کم تر ہو گئے اور ہندی و سنسکرت الفاظ نے ان کی جگہ لے لی۔ ہندی میں وہ آخر تک رسالے بھی نکالتے رہے جو پیسے انھوں نے ناولوں سے کمائے ان کو ماہناموں پر صرف کر دیا اور اس شوق میں برابر مقروض رہے۔ وہ دراصل اس تحریک سے متاثر تھے جو ملک میں کانگریس کی رہنمائی میں نئے جذبات کے ساتھ موجزن تھی اور جس میں جدید خیالات کے ساتھ ساتھ ہندو تہذیب اور پراچین کال کی عظمت کے تصورات بھی شامل تھے۔ ان تصورات کی عکاسی پریم چند کی تخلیقات میں کثرت سے ملتی ہے۔ انھوں نے ہندو معاشرت کی ترجمانی کو اپنایا ہے۔ اسلیئے گئو دان میں گئے کی تقدیس کا تصور ملتا ہے اور وہ تمام امور ملتے ہیں جو ہندو سوسائٹی میں رائج ہیں۔ لیکن صحیح ترجمانی کے لیئے اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اسی بنا پر ہندوؤں کی مذہبی اصطلاحات کتاب میں کثرت سے آگئی ہیں۔

یہ بحث اسلوب کے سلسلہ میں ضروری اس بنا پر ہے کہ جہاں انھوں نے معاشرتی زندگی کا بیان کیا وہاں ان کا اسلوب زیادہ نکھر آیا ہے۔ چنانچہ سردار جعفری لکھتے ہیں "ان کی حقیقت نگاری جتنی گہری ہوتی گئی اور وہ عوام سے جتنے قریب آتے گئے اتنی ہی ان کی زبان بدلتی گئی"۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی زبان کے بہترین اور کامیاب حصے وہی ہیں جہاں انھوں نے کسانوں، مزدوروں یا نچلے متوسط طبقوں کی تصویریں پیش کی ہیں۔ اسلیئے کہ ان کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا۔

اور ان کا مشاہدہ اس بارے میں گہرا تھا۔ خیالات کے علاوہ اس کا اثر زبان پر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ یہاں وہ الفاظ کے ذریعہ پورا ماحول پیش کر دیتے ہیں۔ لفظ کی ایمائیت سے وہ تخیل کو مہمیز دیتے ہیں گئودان میں پریم چند کی زبان انتہائے کمال کو پہونچ گئی ہے۔ یہاں الفاظ اپنے معانی اور تخیل سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتے۔

پریم چند کے اس آخری دور میں جب کہ ان کا اسلوب منفرد اور مستقل حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس میں ہندی الفاظ کی بھرمار نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا اپنی تہذیب، تمدن، مذہب، تاریخ اور معاشرت کی طرف رجحان و میلان ہے۔ انھوں نے اُردو کو اس کے فارسی رنگ سے ہٹا کر اپنے غیر مسلم معاشرہ میں لانے کی کوشش کی۔ پوری کتاب میں مرزا خورشید کے علاوہ کوئی مسلم کردار نہیں حالانکہ ہمارے دیہاتوں میں مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ رہتے بستے ہیں، ایک دوسرے کے درد و دکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ایک گنگا جمنی تہذیب کا منظر پیش کرتے ہیں خصوصاً اس علاقہ اودھ میں جہاں پریم چند نے جنم لیا اور جو ان کے مشاہدات کا ماخذ ہے۔ پریم چند کی کوشش یہ تھی کہ اُردو کو ہندی سے قریب کر دیں اور یہ قربت تہذیبی و معاشرتی اتنی ہی ہو جتنی کہ الفاظ کی قربت۔ دوسرے الفاظ میں پریم چند نے نہ صرف ہندی و سنسکرت الفاظ سے اردو کے دامن کو پُر کر دیا بلکہ عربی و فارسی الفاظ و انداز کے خلاف تحریک چلائی۔ یہ حقیقت ایک نظریہ ہے۔ ایک تجربہ ہے اور ایک تحریک ہے، جسکو عملاً پریم چند نے پیش کیا۔ ممکن ہے۔ میری اس رائے سے اختلاف

کیا جائے مگر حق یہ ہے کہ پریم چند نے اردو زبان کو ہندوستانی اور مقامی الفاظ عبارت، انداز تعبیر اور مجموعی فضا میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر امراؤجان ادا اور گئودان کی زبان کا موازنہ کیجیے اور دیکھیے کہ دونوں میں ہندوستان کی سرزمین ہے۔ یہاں کے شہر ہیں، اشخاص ہیں، واقعات ہیں اور دونوں معاشرتی زندگی پیش کرتے ہیں دونوں میں ایک حقیر اور ناقابل التفات طبقہ کو ہیرو بنایا گیا ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ دونوں کی زبان نہایت آسان اور عام فہم ہے مگر اصل فرق تہذیب کا ہے۔ پریم چند ہندوستانی یا ہندو تہذیب پیش کرتے ہیں مگر رسوا کے یہاں مسلم تہذیب و تصور کی ترجمانی ملتی ہے۔ اس کا مطلب کوئی فرقہ وارانہ مطالعہ نہیں ہے بلکہ تصورات کا تجزیہ ہے کہ دونوں تہذیبیں ہماری اپنی ہیں اور ہمارا قومی سرمایہ ہیں ان میں جس کی ترجمانی بھی کی جائے وہ محمود و مقصود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے گاندھی جی کے نظریہ کی حمایت میں ایسا کیا اور ایک ملی جلی زبان ایجاد کی۔ یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ پریم چند نے ایسا ہندو مسلم اتحاد کی خاطر کیا ہو۔ بہر حال اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی سعی لاحاصل نہیں رہی۔ اس کے ذریعہ ہندی کے ہزاروں الفاظ اردو کے ذخیرے میں اور اردو کے ہزاروں الفاظ ہندی ادب کے ذخیرے میں داخل ہو گئے۔ چونکہ ہندی کے ان الفاظ پر ہندوستانی تہذیب کی چھاپ ہے اسلیئے پریم چند نے درحقیقت ہندی زبان کی توانائی اور ہندی تہذیب کی عظمت سے اردو اسلوب میں ایک جاندار عنصر داخل کر دیا۔ پریم چند کے

اس وسیع ذخیرۂ الفاظ میں سے بعض کو مقبولیت حاصل ہوئی اور بعض نامقبول ہی رہ گئے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان ہندی الفاظ سے کہیں کہیں غربت اور ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ پریم چند نے ہندی الفاظ کے انتخاب میں غلطی کی ہے وہ الفاظ جو مشکل ہیں یا اصطلاحی ہیں جن سے اردو طبقہ ناواقف ہے۔ ان کے بجائے شیریں سبک اور عوام سے قریب تر الفاظ کا اگر انتخاب کرتے تو وہ زیادہ کامیاب ہوتے۔

پریم چند نے اودھ کی دیہاتی زبان کرداروں کے ذریعہ کثرت سے پیش کی ہے انھوں نے یہ دلچسپ رسم ایجاد کی ہے کہ جو کردار واقعی دیہاتی زبان بولتے ہیں ان کے مکالموں کو انھیں کے الفاظ اور لہجہ میں پیش کیا جائے۔ پریم چند کا اسلوب اس طرز کی زبان اور مکالموں سے پُر ہے۔

ان کی مکالمہ نگاری بڑی فن کارانہ ہے۔ انھیں اس امر کا خاص سلیقہ ہے۔ انھوں نے ہر طرز کے مکالمے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ان کے مکالمات میں تنوع ہے اور ان میں حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہر کردار کے مخصوص اندازِ گفتگو، لب و لہجہ کا فرق اور انفرادیت کو انھوں نے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ وہ خود مکالمہ نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "ناول میں مکالمے جتنے زیادہ ہوں اور مصنف کے قلم سے جتنا کم نکلے اتنا ہی وہ خوبصورت ہو گا۔ مکالمہ صرف رسمی نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہر جملہ جو کردار کے منہ سے نکلے اسے اس کے خیالات اور شخصیت پر روشنی ڈالنا چاہیئے۔ مکالموں کیلئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف نفسیات اور حالات سے

مطابقت نہ رکھتے ہوں، بلکہ آسان، عام فہم اور سلجھے ہوئے ہوں"۔

یہ وہ اُصول ہیں جن کو انھوں نے پوری طرح اپنے مکالموں میں ملحوظ رکھا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان کے مکالمے طویل ہو جاتے ہیں اگرچہ گئودان میں ایسے مواقع زیادہ نہیں ہیں۔ محنت کش طبقہ سے ان کی دلچسپی جتنی بڑھتی گئی۔ ان کی مکالمہ نگاری پر حقیقت کا رنگ اتنا ہی گہرا ہوتا گیا۔ ان کے یہاں مکالموں میں کہیں کہیں ظرافت بھی ملتی ہے۔ مگر یہ ظرافت زیرِ لب مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور اس کا وجود ان کے یہاں کم سے کم تر ہے۔

یہاں میں پریم چند کے مکالموں میں ایک عیب کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں، وہ گفتگو کرنے والوں کے نام نہیں لکھتے صرف اندازے سے آدمی سمجھ سکتا ہے یا سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں فلاں مصروف گفتگو ہیں۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ فریقین کے نام وضاحت سے لکھے جائیں تاکہ خلط مبحث نہ ہونے پائے۔

پریم چند کی تشبیہات

تشبیہیں وہی مؤثر ہوتی ہیں جن میں زندگی کا نور جھلکتا ہو جن میں حقیقت کی عظمت نمایاں ہو۔ یہ تشبیہیں اور استعارے دراصل پریم چند کے مشاہدات کی باریکی، دیہاتی معاشرے کے مطالعہ اور ہندی ادب سے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ پریم چند کی تشبیہات نہ تو عقلی ہیں نہ خیالی اور نہ کد و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ وہ سب حسی ہیں اور عام اردو ادب کی فرسودہ روایتی تشبیہوں سے قطعاً الگ انداز کی حامل ہیں۔ ان میں ندرت کا حسن اور حقیقت کی جلوہ سامانی دل کو موہ لیتی ہے۔

مُردے کو ایک من لکڑی سے جلاؤ یا دس من سے اُسے کیا پروا؟ (ص ۱۸۴)

(ہوری) داروغہ جی کے آگے کچھوے کی طرح اندر ہی اندر سمٹا جاتا تھا۔

ٹھنّی نے ایسا سر جھکایا کہ پھر نہ اٹھا سکے۔ چپکے سے چلے گئے جیسے کوئی چور کُتّا مالک کے اندر آجانے پر دبک جائے۔

دلوں میں جو آگ ہے وہ تو کمہار کے بھٹے کی طرح صرف اوپر کی لیپا پوتی سے بجھنے والی نہیں ہے (ص ۵۳۹)

"سلیا کا باپ ہرکھو، ساٹھ سال کا بوڑھا تھا، کالا دبلا اور سوکھی مرچ کی طرح پچکا ہوا، مگر اتنا ہی تلخ و تیز (۔۔)

"سب لوگوں کے کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ بیج ڈالے جا رہے تھے کہیں کہیں گیت کی تانیں سُنائی دیتی تھیں مگر ہوری کے کھیت کسی بیکس

عداوت کے گھر کی طرح سونے پڑے تھے" (ص ۲۹۰)

"مالتی آگ میں پڑ کر چمک اٹھنے والی دھات ہے"۔

میں نے تشبیہوں کا مطالعہ خاص طور سے پریم چند کے اسلوب میں کیا ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ ان کی زبان کے حسن میں تشبیہ کی حقیقت پسندی عبارت کو پر کشش بناتی ہے۔ ان کی تشبیہوں کا انداز اور ماخذ فارسی نہیں ہے۔ وہ تشبیہ عموماً ہندی شاعری سے چنتے ہیں یا دیہاتی تجربات سے حاصل کرتے ہیں۔ یا ہندو معاشرت سے۔ ان کی ان تشبیہوں میں تخیل کا وجود کم ملتا ہے۔ وہ سب عملی زندگی سے عبارت ہیں۔ یہاں تصور میں حقیقت کا جلوہ فوراً نظر آجاتا ہے اور امور و اشیاء نگاہوں میں مصوّر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ تشبیہ ملاحظہ ہو:۔

"اس کے چہرے پر کچھ ایسا جھوٹا عاجزانہ انداز تھا جو بھیک مانگتے وقت موٹے بھکاریوں کے چہرے پر ہوتا ہے"۔

اس طرح لوٹتے چلے "کسی عزیز کی لاش جلا کر مرگھٹ سے لوٹ رہے ہوں (ص ۱۸۶)

مؤخر الذکر تشبیہ خالص ہندو رسم و رواج کی آئینہ دار ہے۔

پریم چند نے دیہاتی زندگی کے مشاہدات اور تجربات سے اپنی تشبیہوں کو عوامیت اور حقیقت پسندی سے قریب تر کر دیا ہے۔ مثلاً یہ تشبیہ ملاحظہ ہو:

"پیر میں ایک بار ٹھوکر لگ جانے کے بعد کسی سبب سے بار بار ٹھوکر لگتی ہے اور کبھی کبھی انگوٹھا پک جاتا ہے اور مہینوں تکلیف دیتا ہے۔ باپ بیٹے کے باہمی خلوص کو آج اسی طرح کی چوٹ لگ گئی تھی اور اب اس پر یہ تیسری چوٹ پڑی (ص ۲۵)

میرا خیال ہے کہ اس طرح کی روزمرہ کے تجربات پر مبنی تشبیہوں سے اردو ادب کا پورا ذخیرہ خالی ہے نہ پریم چند سے قبل اور نہ ان کے بعد کسی نے اس طرح کی حقیقت پسندانہ زبان کے ذریعہ اردو ادب کو عظمت بخشی اور نہ کسی نے ایسی نادر تشبیہوں سے اردو کے دامنِ ادب میں اضافہ کیا۔

اردو ادب کے سارے ذخیرے میں پریم چند اپنی تشبیہات کی عوامیت ندرت، معاشرت کی حقیقی عکاسی اور روزمرہ کے مشاہدات سے قربت کے لحاظ سے ممتاز ہیں ان میں حقائق کے جلوے، تجربات کی توانائی اور عوامی زندگی کی طاقت پوری طرح جلوہ ساماں ہے

یہ وہ انداز تشبیہ ہے جو ہم کو ہندی شعرا خصوصاً کبیر داس اور عبدالرحیم خان خاناں کے دوہوں میں ملتا ہے۔

پریم چند اس میدان میں سب سے نرالے ہیں کہ انھوں نے اولاً تو اسلوب کو فارسی کے بجائے ہندوستانی ماحول میں ڈھالا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے تشبیہ و استعارہ کو معاشرتی رنگ سے ہم آہنگ بنا دیا۔ انھوں نے ایسے استعارے پیش کئے جن سے ہم خوب واقف ہیں اور جن کو سن کر عوام بھی لطف لے سکیں۔ انھوں نے عوامی محاورے، روزمرہ الفاظ اور تلمیح پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تشبیہ و استعارے جن کو ادب میں اثر آفرینی کا مصدر کہا جا سکتا ہے۔ ان کے رُخ کو قطعاً تبدیل کر دیا اور انھوں نے پوری کوشش کی کردہ تشبیہوں کا ایک ایسا ذخیرہ اردو میں داخل کر دیں جو ہندوستانی رنگ و روغن کا غماز اور حقیقت کے جلوے سے منور ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

۱- جس طرح ایک عمدہ ساڑی پا کر وہ پہننے کیلئے بے چین ہو جاتی تھی اسی طرح دل میں کوئی اچھا خیال آئے تو وہ اسے ظاہر کئے بغیر کل نہ پاتی تھی۔ [1]

۲- مس مالتی ؔمہتا کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی جیسے کوئی نومرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے۔[2]

۳- کمبخت کہیں گر کے مر جائے نہ اکھاڑنے لگے ورنہ یہ ساری خوش نصیبی سپنے کی طرح غائب ہو جائے گی۔

۴- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بالکل پونگا پنڈت ہوں۔

۵- ہال میں ایسا شور و غل مچا کہ کچھ نہ پوچھو جیسے پٹاری میں بند قہقہے نکل پڑے ہوں۔" واہ دیوی جی کیا کہنا کمال ہے۔ مس مالتی کمال ہے۔ توڑ دیا نمک کا قانون، توڑ دیا دھرم کا قلعہ توڑ دیا۔ یا رسائی کا گھڑا۔

۶- بھنگ کا نشہ رفتہ رفتہ نیند کی طرح آتا ہے اور دماغ پر چھا جاتا ہے۔ شراب کا نشہ ان (اون کار ناتھ) پر شیر کی طرح جھپٹا اور دبوچ بیٹھا۔

۷- مس مالتی اس کی آنکھ بچا کر کمرے سے نکلنے لگیں کہ وہ باز کی طرح ٹوٹ کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

۸- تنخا نے رائے صاحب کو ڈانٹ بتائی " شیر کی ماند میں گھسنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ میں اسے حماقت سمجھتا ہوں۔

۹- آج وحشی و نا مہذب پٹھانوں کے عشق کیلئے ان کا دل بیقرار تھا جیسے موسیقی کا لطف اٹھانے کے بعد کوئی مست ہاتھیوں کی لڑائی کو دیکھنے دوڑے۔"

---

[1] گئو دان ص ۱۵۷ [2] گئو دان ص ۱۴۴ - ۱۵۴

پریم چند کی مُرقع نگاری

پریم چند نے شخصیتوں کے دلچسپ مرقعے کھینچے ہیں، انھوں نے کئی کرداروں کی شکلیں اس انداز سے پیش کی ہیں جن سے ان کے اعمال بھی مصوّر ہو جاتے ہیں، یہاں اس طرز کے چند مرقعے پیشِ خدمت ہیں۔

"ستھانی کو جاتے دیر نہ ہوئی تھی کہ منگرو ساہ آ پہونچے۔ سیاہ رنگ، توند کمر کے نیچے لٹکتی ہوئی، دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہوئے سر پر ٹوپی، گلے میں چادر، عمر پچاس سے زیادہ نہیں مگر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ گٹھیا کا عارضہ تھا۔ کھانسی بھی آتی تھی۔ لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہوئے اور ہوری کو ڈانٹ بتائی "پہلے ہمارے روپے دے دو ہوری تب اوکھ کاٹو، ہم نے روپئے اُدھار دیئے تھے دان نہیں دیا تھا۔ تین تین سال ہو گئے نہ سود نہ بیاج مگر یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے روپیے ہجم کر جاؤ گے، میں تمہارے مرنے سے بھی وصول کر لوں گا" (ص ۱۳۰)

یہ شکل اور یہ انداز کسی خون چوس دیہاتی ساہوکار، سود خوار کی شخصیت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ پریم چند نے جتنے عمدہ شخصیتوں کے خد و خال پیش کیے ہیں۔ اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اب ایک دوسرا مرقع ملاحظہ فرمایئے:۔

"دلاری ہاتھ پیر میں موٹے موٹے چاندی کے کڑے پہنے، کانوں میں سونے کے جھمکے ڈالے، آنکھوں میں کاجل لگائے، بوڑھے شباب کو

رنگے اور سنوارے ہوئے آکر بولی "پہلے میرے روپئے دو تب او کھ کاٹو، میں جتنا کم کھاتی ہوں تم اتنے ہی سیر ہوتے ہو"۔

یہاں پریم چند نے شخصیتوں کے خاکے ان کے کردار کی مناسبت سے کھینچے ہیں۔ انھوں نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ان کی تصویریں حقیقت سے مطابقت رکھتی ہوں۔ انھوں نے قلم کے ذریعہ سے کرداروں کی معنوی اور ظاہری دونوں قسم کی تصویریں پیش کی ہیں۔

"تو کھے رام ناٹے، موٹے، چندڈے، لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے آدمی تھے۔ بڑا سا پگڑ باندھتے، نیچا کرتا پہنتے اور جاڑوں میں لحاف اوڑھکر باہر آتے جاتے تھے۔ انھیں تیل مالش کرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ پس ان کے کپڑے ہمیشہ میلے کچیلے رہتے تھے" (ص ۴۳۴)

دیہاتی لباس اور انداز سے جو لوگ واقف ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان خاکوں میں حقیقت کا حسن کتنا واضح ہے اور ان میں مرقع کشی کتنی جاندار ہے۔ پورا ناول حسب مرقع اسی قسم کے مرقعوں سے زعفرانِ زار بن گیا ہے۔

سلیا کا باپ ہرکھو ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کالا، دبلا اور سوکھی مرچ کی طرح پچکا ہوا مگر اتنا ہی تلخ و تیز بولا "گر جھگڑا کچھ نہیں ہے ٹھاکر ہم آج یا تو ماتا دین کو چمار بنا کر چھوڑیں گے یا ان کا اور اپنا رکت ایک کر دیں گے۔۔۔۔

تم ہمیں باہمن نہیں بنا سکتے مدا ہم تمہیں چمار بنا سکتے ہیں" (ص ۴۱۰)

یہاں بھی پریم چند نہایت دلکش انداز سے ہرکھو کی شکل اور اسکی گفتگو کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ مصنف کو قدرت کی جانب سے مصورد کا

قلم اور شاعر کا دماغ عطا ہوا ہے۔

پریم چند نے معاشرتی زندگی کو جس طرح ابھارا ہے اور جس مؤثر انداز سے پیش کیا ہے وہ نہایت فن کارانہ ہے۔ ہوری جھوٹی قسم کھا کر دھنیا کو اس جرم پہ مارتا ہے کہ اس نے اس کے بھائی ہیرا کا راز کیوں فاش کیا کہ اس نے گائے کو زہر دیا تھا۔ دھنیا اس موقع پر ان الفاظ میں فریاد کرتی ہے۔

"اس گھر میں آکر میں نے کیا کیا دکھ درد نہیں جھیلا، کس کس طرح پیٹ تن نہیں کاٹا، کس طرح ایک ایک لتے کو ترسی، کس طرح ایک ایک پیسہ جان کی طرح بچا کر رکھا، کس طرح گھر بھر کو کھلا کر اور آپ پانی پی کر سو رہی اور آج ان سارے بلیدانوں کا یہ بدلا، بھگوان بیٹھے یہ انیائے دیکھ رہے ہیں اور اسے بچاتے نہیں دوڑتے" (ص ۱۷۹)

پریم چند نے اردو ادب کو پہلی بار معاشرتی زندگی کی ان کیفیات سے آگاہ کیا ہے۔ جن کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے۔ انھوں نے ہوری اور دھنیا کی رنجشوں اور محبتوں کے ذریعہ بڑے دلکش جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ کبھی مایوسی کے جذبات ہیں کبھی خوشی کے، کبھی بڑھاپے میں جوانی کی حسین یاد ہے تو کبھی مالی پریشانی کا دکھڑا ہے۔ غرض ہر دیہاتی کردار زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جن سے ہم پوری طرح آشنا نہ تھے۔ شہری زندگی کی معاشرت کا بیان اردو میں بہت ہے۔ مگر دیہاتی زندگی کی جزئیات نگاری اور جذبات نگاری پہلی بار گئودان کے ذریعہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہیں موت کی تصویر ہے تو کہیں کھیت کی کہیں جذبات ہیں تو کہیں نفرت غرض پورا ناول انسانی جذبات کا ایک سمندر ہے جس کے کناروں کا پتہ نہیں۔

پریم چند نے ایک خاص انداز سے کرداروں کے جذبات انھیں کی زبان سے ظاہر کئے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مکالموں اور معاملوں کو جذبات کا مظہر بنایا گیا ہے مگر ایسا زیادہ نہیں ہے اکثر کردار خود ہی اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگتا ہے اور اپنے دل کی آرزو بیان کرنے لگتا ہے۔ شاید انھوں نے شکسپیر کے اندازِ بیان سے تاثر قبول کیا ہو جہاں ان کے ڈرامے میں کردار خود بڑبڑاتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ پریم چند نے کچھ اس انداز سے جذبات پیش کئے ہیں کہ کبھی تو وہ کردار کی زبان سے ادا ہوئے ہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان جذبات کا بیان خود مصنف کرداروں کی طرف سے کر رہا ہے۔

ماتادین کے جذبات سلیا کے لڑکے بارے میں ملاحظہ ہوں:۔

اس رات کو جب سارا گاؤں سو گیا اور پیڑ تاریکی میں سما گئے تو وہ سلیا کے دروازہ پر آیا اور پوری توجہ سے بچے کا رونا سُنا جس میں ساری دنیا کی موسیقیت، مسرت اور حلاوت بھری ہوئی تھی" (ص ۵۶۵)

گئودان میں ایک ڈرامائی انداز ملتا ہے۔ اس میں پریم چند شخصیتوں کے مرقعے متحرک شکل میں پیش کرتے ہیں جن سے دیہاتیوں کے تمتماتے ہوئے چہرے، چلم پیتی ہوئی شکلیں، جھگڑا کرتی ہوئی عورتیں اور داڑھی ہلا کر گفتگو کرتے ہوئے بوڑھوں کو عجیب حقیقی و دلکش انداز سے ہمارے سامنے مصور کر دیا ہے۔ ان کیفیات سے دیہاتیوں کی عادتیں بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ عام طور سے یہ حرکی کیفیتیں ڈراموں میں بیان کی جاتی ہیں مگر یہاں پریم چند ڈرامہ کی حرکت کو اپنے کرداروں کو متحرک انداز میں پیش کرنے کیلئے

استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے مختلف حالات میں انسان کے چہرے پر جو جذبات کے ذریعہ کیفیات طاری ہوتی ہیں اور ان کا اظہار چہرے کے نشانات سے ہوتا ہے۔ ان باتوں کو حسبِ موقع بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ جس سے مکالمہ نگاری اور مصوری میں جان سی پڑ گئی ہے۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے ہم کو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ دیہاتی زندگی وہاں کے حالات، دیہاتیوں کی عادت اور مختلف خوشی، رنج اور جلن کے موقع پر نفسی کیفیات اور ان کا بیان چہرے کے ذریعہ سے انھوں نے نہایت فنکاری اور گہرے مشاہدہ کے بعد کیا ہے۔ چنانچہ یہاں اس ناول کے کچھ جملے میں نے نمونۃً پیش کیے ہیں جو میرے دعوے پر دلیل ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کوئی سطحی انداز رکھنے والا ان کیفیات کا بیان اس حقیقی تصویر کشی کے ساتھ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

(۱) جھنگری تمباکو پھانک کر بولے (ص ۴۰۳) (۲) مرزا نے خطاوار کی طرح مسکرا کر کہا (ص ۴۵) ان کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ (۳) داتا دین نے لمبی داڑھی پھٹکار کر کہا (ص ۲۸) (۴) سلیا کی ماں آنکھیں مٹکا کر بولی (ص ۱۰۱) (۵) داتا دین سر اور داڑھی ہلا کر بولے (ص ۲۰۵) (۶) مہتا انھیں خیالات میں غرق تھے کہ وہ لڑکی مس مالتی کو ساتھ لیے آ پہونچی۔ ایک جنگلی پھول کی طرح دھوپ میں کھلی ہوئی اور دوسری گملے کے پھول کی طرح دھوپ سے زرد اور مرجھائی ہوئی (ص ۱۲۵) (۷) مہتا نے چڑھاتے ہوئے کہا (ص ۱۳۷)

منظر نگاری

گئودان میں منظر نگاری بڑی دلکش ہے۔ یہ منظر نگاری کہیں انسانی معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویروں سے متعلق ہے اور کہیں مناظرِ فطرت سے جہاں انکا قلم مناظرِ فطرت کی طرف آتا ہے تو نور کی ندیاں رواں معلوم ہوتی ہیں اور قلم سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ الفاظ اور جملے حُسنِ مجسم معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کی منظر نگاری کے بارے میں ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر لکھتے ہیں کہ ان کی منظر نگاری زبان کے جگمگاتے ہیرے ہیں۔ وہ قدرت کے حُسنِ فراواں اور دلکشی میں انسان کے دکھوں کا مداوا ڈھونڈھتے ہیں۔ انھیں قدرت کے بے پایاں حسن اور دلکش مناظر میں انسان کے دکھ کی یاد ستاتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت سے لطف لینے سے غریب عوام و کسان محروم ہیں۔ یہاں ان کی منظر نگاری کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

"کاتک کی روپہلی چاندنی ساری فضا پر کسی میٹھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ سلیا گھر سے نکلی۔ وہ سونا کے پاس جاکر اُسے یہ مژدہ سنائیگی اب اس سے نہیں رہا جاتا تھا۔ ابھی تو شام ہوئی ہے۔ ڈونگی اس پار تھی اور ملاح کا کہیں پتہ نہیں۔ چاند کھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی پھر ندی میں گھس پڑی۔ ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا۔ اس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز ہے؟"[1]

---

[1] گئودان ص ۱۹۰

یہاں پریم چند ایک بالکل فطری منظر کشی کرتے ہیں جہاں فطرت اپنے پورے جلوے اور حسن کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اس کے برعکس وہ انسانی معاشرے کی مناظر کشی بھی کرتے ہیں اس طرح کا ایک منظر اسی گاؤں کا ملاحظہ فرمایئے جہاں سلیا سونا سے ملنے گئی تھی:

"دیہاتوں میں دن بھر کے ماندے کسان سرِ شام ہی سوجاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں سوتا پڑ گیا تھا۔ متھرا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ سلیا اسے نہ کھلا سکی۔ لوگ اسے اس بھیس میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ وہیں دروازہ پر الاؤ میں ابھی آگ چمک رہی تھی، سلیا اپنے کپڑے سکھانے لگی"[۱]

یہاں مصنف نے نہایت عمدہ انداز سے دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ پریم چند سلیا کا سونا کے گھر سے لوٹنے کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:۔ "وہ بحارو پہلی چاندنی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ ندی کی لہریں اب چاندنی میں نہا رہی تھیں اور سلّو دیوانگی کی سی حالت میں خواب کے سائے کی طرح ندی میں چلی جارہی تھی"[۲]

پریم چند کے قلم کی طاقت دیکھیے کہ ایک ہی چاندنی کیسی عمدہ تعبیر مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں:۔

پریم چند منظر کشی کے بادشاہ نظر آتے ہیں وہ ایک طرف معاشرتی احوال کی تصویر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف مناظر فطرت کی بھی۔ ایک دیہاتی لڑکی جو مہتا کو شکار میں ملی تھی اور ان کے لیئے کھانا پکایا تھا۔ اس کی تصویر ملاحظہ ہو:۔

[۱،۲] گئودان ص ۹۹۔

لڑکی ہاتھوں میں آٹا بھرے ہوئے، سر کے بال بکھرے، آنکھیں دھوئیں سے سرخ اور اشک آلود، کل بدن پسینہ سے تر جس سے اسکا ابھرا ہوا سینہ صاف جھلک رہا تھا آکر کھڑی ہوگئی" (ص ۱۴۷)

"وہ دوڑتی، ہانپتی، چلی آرہی تھی وہی کالی کلوٹی لڑکی، ہاتھ میں ایک جھاڑ لیئے ہوئے۔ پاس آکر مہتا کو کہیں جانے کیلئے تیار دیکھ کر بولی۔ میں وہ جڑی کھوج لائی ابھی گھس کر لگاتی ہوں مگر تم کہاں جارہے ہو۔ ماس تو پک گیا ہوگا۔ میں باٹیاں سینکے دیتی ہوں وہ ایک کھا لینا۔ بائی دودھ پی لیں گی۔ ٹھنڈے میں چلے جانا" (ص ۱۴۰)

ان سطور میں مصنف نے گھریلو لڑکیوں اور ان کے خلوص کا بڑا عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ اس نے اس وقت کی حالت دکھائی ہے۔ جب شمالی ہند میں عورتیں روٹی پکاتی ہیں، بیسروں روٹیاں اور گرمی کا موسم وہ پسینہ سے شرابور ہوجاتی ہیں۔ دوسرے اقتباس میں اس لڑکی کی مہمان نوازی کے جذبات کو مصور کیا گیا ہے۔ اس طرز کی عبارتوں سے گئودان مملو ہے، جہاں اصل زندگی کے حقیقی نقشے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور تصور و حقیقت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ یہاں مصنف کے مشاہدہ کی باریکی کا قائل ہوجانا پڑتا ہے۔ اس نے وہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان مناظر کو دیکھ کر انسان کی طبیعت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے زندگی کی ایسی تصویریں پیش کی ہیں کہ جن میں جذبات اور خیالات دونوں حقیقت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پڑھنے والا ناول میں نہیں رہتا بلکہ حقائق حیات سے اس طرح لطف اندوز

ہوتا ہے۔ جیسے یہ معاملات خود اس کو پیش آئے ہوں۔

مسٹر ٹمٹا جب ہرن کو اٹھانے کی تیاری کرتے ہیں تو اس کا منظر اس طرح سامنے آتا ہے۔

"ٹمٹا نے جوتے کا فیتہ پھر سے باندھا، کوٹ اتار کر لکڑہارے کو دیا۔ پتلون اوپر چڑھایا، رومال سے منہ پونچھا اور اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں۔ پھر ہرن کو گردن پر رکھنے کی کوشش کی دو تین بار زور لگانے پر لاش گردن پر تو آ گئی مگر گردن نہ اٹھ سکی کمر جھک گئی۔ ہانپ اٹھے اور لاش زمین پر پٹکنے ہی والی تھی کہ مرزا نے انھیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ وکیل صاحب کا برا حال تھا وہ بے جان ہرن شیر کی طرح انھیں دبوچے ہوئے ان کے دل کا خون پی رہا تھا۔ ساری طاقت جواب دے چکی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سر پر چکر آیا وہ شکار گردن پر لیئے ہوئے پتھریلی زمین پر گر پڑے" (ص ۱۹۲)

حقیقی زندگی میں اس طرح کے کتنے واقعات پیش آتے ہیں پھر اس میں ٹمٹا کی ایک نفسیاتی کیفیت کا بیان ہے وہ لالچی ہیں۔ مرزا نے شرط کی کہ اگر تم ہرن اٹھاتے چلو تو میں الکشن لڑوں گا۔ کمیٹی کا ڈائرکٹر بن جاؤں گا۔ ٹمٹا نے لالچ میں اٹھایا اور رسوا ہوئے۔

ہوری نے ہیرا کی حمایت میں گوبر کے سر پہ ہاتھ رکھکر جھوٹی قسم اسطرح کھائی:۔

"ہوری نے گوبر کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھکر کانپتی ہوئی آواز میں کہا، میں بیٹے کی کسم کھاتا ہوں کہ میں نے ہیرا کو ناند کے پاس نہیں دیکھا" (ص ۱۷۸)

موسم اور فطری منظر کی تصویریں حسب موقع پریم چند کھینچتے ہیں، وہ

گاؤں کے کھلیان کا منظر، گرمی کی شدت کا بیان، برسات کی ڈراونی راتیں اور سردی کی خون جما دینے والی گھڑیاں بڑی حقیقی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہوری جاڑے میں ایک پرانی مرزئی اور پھٹا کمبل جو اس کے باپ نے خریدا تھا۔ اس کو لیکر دسمبر کے جاڑوں میں کھیت میں لیٹتا ہے مگر جاڑے سے نیند نہیں آتی۔ اس کا منظر ملاحظہ ہو:۔

"ماگھ کے دن تھے مہاوٹ لگ رہی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک تو جاڑوں کی رات دوسرے ماگھ کی برکھا موت کا سناٹا تھا۔ ہوری کھانا کھا کر بنیا کے مٹر کے کھیت کی مینڈ پر اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سو رہے مگر تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی مرزئی اور ٹھنڈا گیلا پسوال اتنے بیریوں کے سامنے آنے کی ہمت نیند میں نہ تھی۔ آج تمباکو بھی نہ ملا کہ اس سے دل بہلاتا اپلا سلگا لایا تھا پر وہ بھی ٹھنڈ سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بوائی پھٹے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر اور کمبل میں منھ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا" (ص ۱۹۳)

اس اقتباس میں ایک غریب کسان کا سردی کے موسم میں جو عالم ہوتا ہے۔ اس کی نہایت دلکش تصویر ہے۔ ایک طرف مصنف نے کھیت میں لیٹنے، سردی سے آگ بجھ جانے اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر سونے کا جو منظر کھینچا ہے وہ واقعی حقیقی ہے اور پریم چند کے صداقت مشاہدہ پر دلالت کرتا ہے۔

"سہانی ایسی مذاقیہ خوشامد سے نہتی سی ہو جاتی تھی۔ مسکراتی ہوئی

اپنی راہ چلی گئی۔ ہوری لیکر بیلوں کے پاس پہونچ گیا اور اناج ماڑنے لگا۔ سارے گاؤں کا یہی ایک کھلیان تھا کہیں اناج مانڈا جارہا تھا کہیں اُسایا جارہا تھا اور کوئی تول رہا تھا۔ نائی باری بڑھئی لوہار پروہت بھاٹ بھکاری سبھی اپنے اپنے جیورے لینے کیلئے جمع ہو گئے تھے۔ ایک پیڑ کے نیچے جھنگری سنگھ کھاٹ پر بیٹھے اپنی سوائی وصول کر رہے تھے۔ کئی بنئے کھڑے ہوئے اناج کا مول تول کر رہے تھے۔ سارے کھلیان میں منڈی کی سی رونق تھی ایک کھٹکن بیر اور مکوئے بیچ رہی تھی اور ایک خوانچہ والا تیل کا سیو اور جلیبیاں لئے گھوم رہا تھا۔ پنڈت داتادین بھی ہوری سے اناج بٹوانے کیلئے آپہونچے تھے اور جھنگری کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے" (ص ۴۰۳)

یہ منظر کتنا دلکش، حقیقت سے پُر اور موثر ہے۔ خصوصاً اس کا تصور کیجئے کہ کسان کس مشقت کے بعد اس وقت تک پہونچے جب کہ اپنے خون پسینہ کی کمائی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں دوسری طرف سماج کے استحصال کرنیوالے طبقات کس طرح شکاری جانوروں کی طرح کھلیان پر حملہ آور ہیں۔ پریم چند کا قلم فطری مناظر کے ذریعہ کسان کی حالت اور اس کی زندگی کی بے کیفی کو مصوّر کرتا ہے۔ یا غوں میں کھلیان کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے مگر اس دلکشی میں مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ سے کسانوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے اور ان کے دلوں پر بے کیفی طاری تھی۔

اب ایک دوسرا منظر ملاحظہ ہو۔

" پھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لے کر آپہونچا تھا آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی

اپنے رگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی" (ص ۳۳۴)

یہاں مصنف نے آم کے بور کی مہک اور کوئل کی کوک کا ذکر کرکے دیہاتی زندگی کے ایک نہایت دلکش پہلو کو پیش کیا ہے۔

پریم چند نے حسب موقع جاڑے، گرمی، برسات اور دوسرے فطری وموسمی حالات کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ اکثر ان مناظر کی حقیقی کیفیت ان کی عبارت کو جان دار بنا دیتی ہے۔

"سورج سر پر آ گیا تھا۔ اس کی تپش سے متاثر ہوکر پیڑوں نے اپنا پھیلاؤ سمیٹ لیا تھا۔ آسمان غبار آلود ہو رہا تھا اور سامنے کی زمین کانپتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی"

اس قسم کی عبارتیں عام ہندی آمیز عبارتوں سے قطعاً مختلف ہو جاتی ہیں۔ یہاں جملوں میں ایک جوش، ایک ادبی دلکشی، مشاہدات کی گہرائی اور حقیقت کی جلوہ فرمائی انھیں ترشے ہوئے ہیروں کی طرح روشن و نمایاں بنا دیتی ہے اب ایک عبارت ملاحظہ ہو۔

"ندی کے کنارے چاندی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے۔ میٹھے سُروں میں گا گا کر چاند اور تاروں اور غنودگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی۔ مہتا قدرت کی متوالی چھین پر جیسے مست ہو گئے گویا ان کا بچپن اپنے سارے کھیلوں کے ساتھ لوٹ آیا ہو۔ ریت پر کودتے اور دوڑتے ہوئے، ندی میں جا کر گھٹنے تک پانی میں کھڑے ہو گئے" (ص ۱۰۵)

یہاں بھی مصنف نے ایک ایسی تصویر پیش کی ہے۔ جہاں محض منظر کا حسن ہی

نہیں ہے۔ بلکہ بچپن کے کھیل کود کے عود کرنے کا ذکر اس کیفیت حسن و نور میں ایک دوسرا دلکش تخیل بھی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اکثر فطرت کے ساتھ انسانی تعلق اور اس کے انسان پر اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسا شاید وہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ مبادا کہیں محض شاعرانہ منظر ہی مقصد نہ بن جائے لہذا اس منظر سے زندگی کا ربط قائم کر کے یہ اس کو زیادہ دلکش اور زیادہ جاندار بنا دیتے ہیں۔

ان مختلف مناظر کے اقتباسات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف کے قلم کو فطری مناظر اور معاشرتی مناظر دونوں کی تصویر کشی اور ان کے حقیقی خد و خال کو سامنے لانے پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ مصنف نے ایک ایک پہلو کو بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ شلاً کسان کھیت میں کڑاکے کے جاڑوں میں فصل کی حفاظت کے لیئے جا کر سوتا ہے۔ اس کی منظر کشی میں جاڑوں میں آگ کا مشکل سے جلنا کسان کے پاس کپڑوں اور کمبلوں کی کمی اور جاڑوں کے باعث فضا میں سناٹا پھر جاڑے کی شدت سے اس کا نیند کا نہ آنا۔ یہ سب مختلف کیفیات ہیں اور نہایت حقیقی جن کو پریم چند کے گوہر بار قلم نے مختلف مواقع پر مناسبت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان مواقع پر ان کا قلم الفاظ کا حسن بکھیرتا ہے۔ جذبات کے دریا بہاتا ہے۔ حقائق کے جلوے دکھاتا ہے۔ تشبیہات کی ندرت سامنے لاتا ہے۔ حسن ترکیب سے عبارت کو زعفران زار بناتا ہے اور فطرت کے ساتھ انسانی معاشرت کے حسن امتزاج کی کیفیت کو نمایاں کرتا ہے۔

دیہاتی الفاظ

پریم چند کی زبان پر دیہاتی الفاظ، دیہاتی محاورہ، دیہاتی انداز تعبیر اور دیہاتی روزمرہ کا استعمال گئودان میں بڑی کثرت سے نظر آتا ہے وہ محض یہ نہیں کرتے کہ کرداروں کی زبان سے دیہاتی لہجہ اور اودھی کا دیہاتی روپ پیش کرتے ہیں بلکہ ان کی زبان پر گاؤں کی زندگی کی پوری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ ان الفاظ کو خاص طور سے استعمال کرتے ہیں جو ادب کا جو نہیں ہیں اور فصیح زبان میں ان کے لیے دوسرے دلکش الفاظ موجود ہیں مگر پریم چند کو پریم ان دیہاتی الفاظ سے ہے جو گاؤں میں رائج ہیں، جن سے ہندوستان کی ستر فیصدی آبادی کی زندگی، خوشی، غم، معاملات مشکلات اور جد وجہد کی عکاسی ہوتی ہے جو ان کے جذبات، خیالات، احساسات، واردات اور نفسی کیفیات کی عمدہ تعبیریں پیش کرتے ہیں جن میں زندگی کے حقائق، معاشی کشاکش کی کہانی اور کسانوں کے محدود مگر متنوع حالات کی ترجمانی پوری طرح ہوتی ہے۔ گاؤں کے معاشی حقائق، کھیتوں کے مسائل، باہمی جھگڑے، مذہبی رسومات، توہم پرستی، جہالت کی مصیبتیں، باہمی رقابتیں اور اعزہ کی ریشہ دوانیاں وغیرہ مختلف حالات و کیفیات کی مصوری جتنی عمدہ دیہاتی الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس کے مماثل و مترادف شہری الفاظ ہرگز ان کیفیتوں کو مصور نہیں کر سکتے۔

پریم چند نے دیہاتی الفاظ سے اپنا دامن بھر لیا ہے جس سے انکو وسعت وعظمت کے نئے آفاق ہاتھ آ گئے ہیں جن سے ان کی عبارتوں میں زندگی کی رونق وتوانائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے فکر کو مناسب الفاظ میں ڈھالا ہے انھوں نے ایسے سمندر کو قابو میں کر لیا ہے۔ جس کے کناروں کا پتہ نہیں۔ دیہاتی زندگی ہندوستان کی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے الفاظ حقائق کی چکی میں پس کر معاشرہ کے مجسم ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان میں تصنع، تکلیف اور شہری انداز کے ذہنی تعیش کی بو نہیں آتی۔ دیہاتی الفاظ حالات کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں صحیح تصویر کشی کی جو صلاحیت ہوتی ہے۔ اس سے فصیح الفاظ قاصر رہ جاتے ہیں۔ میرے خیال سے پریم چند کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے گاؤں کے مروجہ الفاظ سے اپنے اسلوب کے تانے بانے درست کئے ہیں۔ اور ایک ایسی حسین عمارت تعمیر کی ہے۔ جس میں زندگی کی وسعتیں، رعنائیاں اور حقائق کی روشنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے گئودان میں ہندوستانی عوام کے مسائل ان کی زبان، ان کے احساسات اور ان کے معاشرہ کے آئینہ میں دکھانے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔

دھنیا نے زمین پر تھوک کر کہا "تھڑی ہے تیری جھٹائی پر" ہوری پاؤں پٹک کر بولا! بس مت دلا نہیں تو برا ہوگا (ص ۱۷۸)

اپنی غرض پڑنے پر گدھے کو دادا کہنے والا" (۵۲۸)

"سچ ہے پھوٹی ہنڈی کو ابنتے دیر نہیں لگتی"

"جس کے دانت نہیں دکھے وہ دانتوں کا درد کیا جانے"

سلیا حلق میں نمک کی ایک ڈلی سی محسوس کرتی ہوئی زخمی دل اور

سست ہاتھوں سے پھر کام کرنے لگی (ص ۴۰۸)

"جس ڈال پر وہ بے فکری سے بیٹھی تھی وہ ڈال ٹوٹ گئی"

آپ کے پاس زمین نہیں جائیداد نہیں رواجی بندش نہیں۔ آپ بے خوف ہو سکتے ہیں مگر آپ بھی دم دبائے بیٹھے رہتے ہیں کتنی رشوت چل رہی ہے۔ کتنے غریبوں کا خون ہو رہا ہے کتنی عورتیں بدراہ ہو رہی ہیں۔ بورنہ نکھنے کا (ص ۴۱۸)

گاؤں والوں کے سامنے جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے وہ کھا لیتے ہیں اسی طرح جیسے انجن کوئلہ کھا لیتا ہے (۵۸۳)

ایسے محاورے، استعارے، انداز تعبیر اور دیہاتی و مقامی غیر فصیح الفاظ روزمرہ کے حقائق کی تلمیح قاری کے سامنے امور و اشیاء کو متوقع کر دیتی ہے۔ پریم چند کی خوبی یہ ہے کہ وہ دیہاتی روزمرہ کو فصیح زبان سے ملا کر زبان کو وسعت و عظمت عطا کرتے ہیں اور معاشرتی زندگی سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ اس ناول میں ہزاروں دیہاتی الفاظ، تراکیب، افعال اسماء، تلمیحات، تشبیہات استعارے فصیح زبان کے ساتھ مل جل گئے ہیں۔

ہوری "میں تیرے باپ کے پاؤں پڑنے گیا تھا، وہی تجھے میرے گلے باندھ گئے"

دھنیا:۔ "پتھر پڑ گیا تھا ان کی سمجھ پر اور انھیں کیا کہوں! نہ جانے کیا دیکھ کر لٹو ہو گئے۔ ایسے کوئی بڑے سندر بھی تو نہ تھے تم" (ص ۴۲۱)

گوبر:۔ اتنا نیچ نہیں ہوں جیونا جب بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک نبھاہوں گا"۔ ۔

جھنیا گھر کی طرف چلی۔ گوبر پیچھے کھڑا دبدھے میں پڑا ٹھکرا رہا (ص ۱۷۲)

بھولا کھسیا کر بولا:- دور ہو میرے سامنے سے 'بھگوان نہ کرے کہ مجھے تیرا منہ دیکھنا پڑے کلیجھی' ، کلنکنی کہیں کی اب تیرے لیے ڈوب مرنا ہی ٹھیک ہے (ص ۲۵۲)

لیڈروں کے سر جھک گئے اور تھانیدار کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ ہوری متحیر سا کھڑا رہا زندگی میں آج پہلی بار دھنیا نے اسے بھرے اکھاڑے میں پٹک دیا۔ آسمان دکھا دیا اب وہ کیسے سر اٹھائے (ص ۱۶۲)

اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں (ص ۶۲)

کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی اپنے لاگوں کی خفیہ خیرات کر رہی تھی (ص ۲۲)

ہوری نے روپیے لیے اور انگوچھے کے چھور میں باندھے خوش خوش داروغہ کی طرف چلا (ص ۳۳)

گائے گیا جیبھ نکال کر کھا لیتی تھی اور جب تک ان کے ہاتھ کو ر (نوالہ) نہ پالیتی کھڑی تاکتی رہتی۔ بھاگ پھوٹ گئے (ص ۱۷۵)

افوہ ہیرا من کا اتنا کالا ہے اور دار ی جار کو میں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا۔

پریم چند کی دیہاتی زبان ناول پر محیط ہے مگر صرف دیہاتی کرداروں میں ان کا استعمال ہوا ہے۔ یہ زبان نہ بالکل دیہاتی ہے جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں اور نہ بالکل شہری ہے' بلکہ دیہاتی الفاظ اور انداز کو شہری زبان کے ڈھانچہ میں اسلیئے ڈھالا گیا ہے کہ اس کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔ اس زبان سے سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے کہ دیہاتی کرداروں کو دیہاتی ماحول میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر یہ زبان نہ ہوتی۔ دیہاتی الفاظ نہ ہوتے اردو ہندی

ماحول نہ ہوتا تو اس ہندو معاشرہ کی تصویر جس کی ترجمانی کو پریم چند نے اپنا مقصد بنایا ہے۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہوتے۔ انھوں نے ایک منظم انداز سے اردو زبان میں نئے تجربے کیئے ہیں ان کے الفاظ اور ان کی زبان سے اُردو میں ہزاروں دیہاتی اور ہندی کے الفاظ جذب ہو گئے۔ مگر ان کا اصل فائدہ وہ ہندوستانی ماحول ہے جو ان کے ذریعہ ناول میں پیدا کیا گیا ہے۔ انداز گفتگو اور اس کا لہجہ ان کے یہاں نئے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پریم چند نے یہ ترمیم اس خیال سے کی ہے کہ اردو اور ہندی داں طبقہ جو ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتا ہے آسانی سے سمجھ سکے ورنہ بہت سے علاقوں کے لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہجاتے ہیں۔

ذیل کے جملوں پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے انکے لہجے کی نزاکت اور انکی ادائیگی کی اجنبیت سے گھبرا کر انکو کافی مہذب بنا لیا ہے صرف تلفظ اور بعض دیہاتی الفاظ کو رہنے دیا ورنہ ان کا ڈھانچہ فصیح زبان کا ہے' وہ "کرے" یا "کردیپ" یا "کرب" کے بجائے کریں کے استعمال کرتے ہیں جس سے فصیح زبان والوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ زیادہ شدید دیہاتی الفاظ بھی وہ استعمال نہیں کرتے آسانی کے لحاظ سے ان کا یہ کام بھی عمدہ ہے کہ انھوں نے دیہاتی زبان کو اس لائق بنا کر پیش کیا ہے کہ اس کو ہر اردو داں آسانی سے سمجھ سکے ورنہ لہجہ اور الفاظ کی وجہ سے وہ اکثر ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔

پریم چند کی دیہاتی ترمیم شدہ زبان	اصل دیہاتی زبان
تجھے تو دادا پر بڑی دیا آتی ہے بیچارے دن بھر کے تھکے ماندے گھر آئے تو اماں	ہم کا تو دادا پر بڑی دیا آوت ہے بیچارے تھکے ماندے گھر آے تو اماں

"کوسنے لگیں مہاجن گلا دبائے تھا تو کیا کرتے"؛ (ص ۳۰۶)	کوسنے لاگیں۔ مہاجن گلا دبائے رہئے تو کا کرتے؛
"مہاجن اپنے روپیئے چاہتا ہے اسے تمہارے دکھڑوں سے کیا مطلب"؛ (۳۰۶)	مہاجن اپنے روپیئے چاہت ہے وہ کا تمہرے دکھڑان سے کا مطلب؛
"کیوں اس میں گالی کی کیا بات ہے" (۲۹۶)	کاہے کا یہ ماں گاری کی کون بات ہے۔
"آج تو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہاں سے آگ جلتی"۔ (ص ۲۹۱)	آج تو گھر ماں کچھو رہبے نہ کرے آگ کہاں سے جلت۔
"اماں سے کون کہنے جائے گا (ص ۲۹۱)	اماں سے کے کہئے جائے؛

گئودان میں جو دیہاتی زبان استعمال ہوئی ہے وہ دراصل ترمیم شدہ ہے۔ اس میں الفاظ تو اکثر دیہاتی ہیں مگر لہجہ فصیح زبان کا ہے۔ یو۔ پی اور خصوصًا اس علاقہ کے لوگ جہاں سے پریم چند کا تعلق ہے وہ دیہاتی نہیں بولتے جو انھوں نے استعمال کی ہے۔ دیہاتی زبان کو ادا کرنا بڑا مشکل ہے اس میں لہجہ کو پوری طرح قلم بند کرنا آسان کام نہیں۔ پریم چند نے الفاظ، جملے اور انداز تعبیر تو دیہاتی رکھا ہے۔ مگر ان جملوں کا اختتام، حروف روابط اور بعض ضروری لفظوں کا تلفظ فصیح رکھا ہے۔ ہم اسکو "پریم چندی دیہاتی زبان کہہ سکتے ہیں۔ دیہاتی کبھی یہ زبان اس انداز سے نہیں بولتا۔ یہ زبان وہ شخص ضرور استعمال کر سکتا ہے جو جاہل ہو دیہاتی ہو اور کچھ دن شہر میں رہ چکا ہو یا شہر کے وہ دیہاتی جو مزدوری کرتے وہاں جاتے ہیں وہ بھی اس قسم کی زبان بول سکتے ہیں۔ چونکہ میں خود اودھی دیہاتی بولی سے واقف ہوں اسلیئے میں یہ رائے بربنائے واقفیت دے رہا ہوں اور اب اس دعوی کو مدلل کرنے کیلئے پریم چند کی ترمیم شدہ دیہاتی اور اصل عوامی زبان کا تقابلی نقشہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

ہندی الفاظ

یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ پریم چند الفاظ کا استعمال اکثر ہندی کی مناسبت سے کرتے ہیں، وہ اس کی پابندی نہیں کرتے کہ اردو میں وہ کس معنی میں مستعمل ہیں، وہ در اصل مجتہد ہیں مقلد نہیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر لفظ "موہ" کو پیش کرتا ہوں۔ اردو میں یہ لفظ جیت لینے لبھانے اور اپنی طرف مائل کر لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اس نے ان کے دل کو موہ لیا" مگر پریم چند اس لفظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں" آنسو بتلا رہے تھے کہ موہ کا بندھن توڑنا کتنا مشکل ہو رہا ہے جو کچھ اپنے سے نہیں بن پڑا اسی کے دکھ کا نام تو موہ ہے۔ ادا کئے ہوئے فرائض اور پورے کیے ہوئے کاموں کا کیا موہ ؟ موہ تو ان بیکسوں کے چھوڑ جانے میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنا فرض نہ نبھا سکے ان ادھورے منصوبوں میں ہے جنھیں ہم پورا نہ کر سکے"۔

اسی طرح ایک لفظ کالک ہے۔ پریم چند اس کو کالکھ استعمال کرتے ہیں۔ ہوری ایسا چھپا بیٹھا تھا جیسے منہ میں کالکھ لگی ہو" (ص ۵۸۶)

اسی طرح لفظ دھرم ہے وہ اردو میں مذہب کے معنی میں مستعمل ہے مگر پریم چند فرائض کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جسکی مثالیں میں کہیں پیش کر چکا ہوں

یہی نہیں پریم چند کثرت سے دیہاتی الفاظ کا استعمال کرداروں کی زبان کے علاوہ خود بھی کرتے ہیں اور ان مواقع پر بھی دیہاتی الفاظ کا استعمال روا رکھتے ہیں جہاں فصیح الفاظ اردو میں مشہور و مستعمل ہیں یہ وہ اس خیال سے

کرتے ہیں کہ زبان میں عوامیت اور عمومیت پیدا ہو۔ وہ ہندوستانی معاشرے سے قریب تر ہو۔ اِس میں زندگی کا رس اور روغن محسوس ہو۔ عوامی مسائل کے ساتھ عوامی زبان کا استعمال اُردو زبان کیلئے پہلا عظیم تجربہ تھا جس کو پریم چند نے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ غریبوں اور کسانوں کے مسائل میں گہرے نفسیاتی مشاہدے سے کرداروں میں رنگ بھرتے ہیں۔ دیہاتی مثلوں سے کام لیتے ہیں۔ دیہاتی طرز تعبیر پر جان دیتے ہیں اور عوام کے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہندی الفاظ کے ساتھ دیہاتی الفاظ کی کثرت ہے۔ ہندی کے نامانوس الفاظ ان کی اردو کو ثقیل بناتے ہیں، مگر دیہاتی اور عوامی الفاظ و تعبیریں ان کے اسلوب کو رنگ و نور عطا کرتی ہیں۔ البتہ ہندی کے معروف اور عوامی الفاظ بھی دلکشی پیدا کرتے ہیں صرف وہ الفاظ جو ادبی ہندی کے مشکل الفاظ ہیں ان سے ذرا ذوق پر اثر پڑتا ہے۔

خوبیوں کے ساتھ پریم چند کی زبان میں ہندی کے نامانوس الفاظ استعمال کرنے کا عیب ہے۔ ان کی عبارتیں اس غیر معمولی عیب کی وجہ سے کہیں کہیں اپنا حسن کھو بیٹھتی ہیں۔ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہموار زمین پر چلتے چلتے گڑھے میں گر پڑا ہو۔ ان کے نامانوس الفاظ نامانوس اصطلاحات اور بالکل دیہاتی انداز تعبیر بعض موقعوں پر ادبی حسن کھو بیٹھتا ہے۔ مثلاً یہ چند الفاظ پیش ہیں:۔ انرتھ۔ تیج۔ اڈن۔ پرواشچت مرجاد۔ پرہم۔ ادھار۔ سارتھ۔ سانچات۔ اِچھا۔ دُشٹ۔ بھورت کنڈ۔ ایکادشی۔ سانوں ادھیائے۔ بن اور بھاتم۔ بھگتی کی بھینٹ۔ کلچھنی۔ کلنکنی وغیرہ۔

چند عیوب کی نشان دہی

خالص اُردو داں کے لیے پریم چند کی زبان میں دھکے بلکہ کھانچے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ نامانوس اور غریب انداز دو طرح سے سامنے آتا ہے ایک ہندی کے ان الفاظ کے ذریعہ جن سے اردو داں طبقہ بالکل ناواقف ہے اور یہ اس کے لئے ثقیل ہیں۔ دوسری اجنبیت اکثر نامانوس انداز تعبیر ہے۔ کسی بات کو کہنے کیلئے "دھرم" کا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔ جس سے ہم واقف نہیں۔ اب میں اپنے دعوٰی کو مدلل کرنے کیلئے عبارتیں یہاں نقل کرتا ہوں جن سے انداز تعبیر کی اجنبیت، ثقیل الفاظ اور ہندو تہذیب تینوں عناصر کا نقشہ سامنے آجائے گا۔

گوبر کو دئی کی ماں سے کہتا ہے: ۔

"تم بڑی ہو ماتا جی ، پوجنے جوگ ہو ۔ پتر ماتا کے رِن سے سو جنم لیکر بھی اُرِن نہیں ہو سکتا۔ کروڑ جنم لے کر بھی نہیں ۔ بوڑھی اس بے حساب بھگتی پر گمن ہو گئی"۔

گوبر اپنے آپ سے کہتا ہے، ۔

"بھگوان اب تمہارا ہی بھروسہ ہے میں نہ جانتا تھا کہ اس سنکٹ میں جان پڑے گی۔ جھنیا اپنے من میں کتنا مکار ڈرپوک ۔ کمبخت سمجھ رہی ہو گی مگر اُسے مار کیسے سکتے ہیں، اگر جھنیا پر ہاتھ اُٹھایا تو مہا بھارت ہو جائیگی۔ ماں باپ جب تک لڑکوں کی اِچھا کریں تب تک ماں باپ ہیں۔ جب ان کی

ممتا ہی نہیں تو کیسے ماں باپ ؟" (ص ۲۲۷)

دھنیا نے اسکی (ہیرا کی) طرف حقارت سے دیکھا۔ اب وہ دل کو
ود کتنا کڑا کرے۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ اس کا جو دھرم ہے گیا یہ اس کو نبانا
ڑے گا۔ جو زندگی کا ساتھی تھا۔ اس کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے"
ھنش یگیہ ان کیلئے صرف تماشا نہیں بلکہ بھگوان کی لیلا تھی (ص ۱۱۶)

"ہوری رو پیہ لیکر اٹھا ہی تھا کہ سنکھ کی آواز کانوں میں آئی۔
گاؤں کے دوسرے سرے پر دھیان سنگھ نامی ایک ٹھاکر رہتے تھے۔
وج میں نوکر تھے۔ کئی دن ہوئے کہ دس سال بعد رخصت لیکر آئے تھے۔
بغداد، عدن، سنگاپور، برما چاروں طرف گھوم چکے تھے، اب بیاہ کرنے کی فکر
یں تھے۔ اسی لیئے پوجا پاٹ کر کے برہمنوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔

ہوری نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ ساتوں ادھیائے پورے ہو گئے۔ آرتی
و رہی ہے۔ ان کی کتھا میں جا کر آرتی میں کچھ نہ دینا ذلت کی بات تھی۔ آرتی کا
ھال ان ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان کے سامنے ہوری کیسے خالی ہاتھ آرتی لے گا۔
ں سے تو اچھا ہے کہ وہ کتھا میں جائے ہی نہیں۔

"مگر وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی
یں ہے۔ تانبے کا ایک پیسہ آرتی کے پن اور مہاتم کا اسے بالکل دھیان نہ تھا۔
ت تھی صرف بیوپار کی۔ ٹھاکر جی کی آرتی ہو تو وہ صرف اپنا بھگتی کی بھینٹ
ے سکتا تھا مگر رواج کیسے توڑے، سب کی نگاہوں میں پوجا کیسے بنے، (ص ...)

بھولا کھسیا کر بولا "دور ہو میرے سامنے سے" بھگوان نہ کرے کہ مجھے تیرا
نہ دیکھنا پڑے کلچھنی، کلنکنی کہیں کی۔ اب تیرے لئے ڈوب ہی مرنا ٹھیک ہے۔

جھنیاتے اس کی طرف تاکا بھی نہیں۔ اس میں وہ غصہ تھا جو خود کو نگل جانا چاہتا ہے۔ جس میں ہنسا نہیں بلیدان ہے۔ دھرتی اس وقت منہ کھول کر نگل لیتی تو وہ اپنے آپ کو کتنا دھنیہ مانتی" (ص ۲۵۲)

اس ناول کا ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستان میں ذات پات کی بنیادوں پر جو سماج میں مسائل وجود میں آتے ہیں ان کا ذکر نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھیں خطوط پر الکشن لڑے جاتے ہیں اور انھیں بندھنوں کے تحت تمام مسائل طے ہوتے ہیں۔ ہندو سماج میں ذاتوں کی تقسیم اور ان کے اثرات سے ناول میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے بلکہ اس کے اثرات کے مطالعہ کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شہر کے کرداروں میں تو اس کا کہیں وجود نظر نہیں آتا۔ دیہاتیوں میں اس کا ذکر آیا ہے مگر پریم چند کی غلطی یہ ہے کہ ذات پات کو انھوں نے سماج کے بنیادی محرک عنصر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے جب پورے ہندوستانی سماج اور سیاست کی بنیاد درحقیقت ذات پات پر ہے اور ہر گاؤں پر اس کے اثرات نمایاں ہیں تو ان کو نظر انداز کرنا ایک بڑا خلا ہے۔ پریم چند نے صرف ان طبقاتی کشاکش کی ترجمانی کی ہے جو استحصال کرتے ہیں مگر اونچی ذات کے ہندو نیچ ذات والوں پر جو مظالم کرتے ہیں اور جس طرح دیہاتوں میں جتھہ بندی کر کے ان کو کچلتے ہیں اس کی ترجمانی سے کتاب کا خالی ہونا درحقیقت دیہاتی زندگی کی کم از کم مکمل ترجمانی نہیں کہی جا سکتی۔ ماتا دین کے منہ میں ہڈی ڈالنے سے اونچی ذات کے خلاف چماروں کے باغیانہ جذبات کی ترجمانی ہے مگر جو مظالم اجتماعی طور پر اعلیٰ ذات والے نچلوں پر ڈھاتے ہیں اس کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی وہ تصویر سامنے آ سکے

جس سے پورا سماج مسموم ہے۔

حد تو یہ ہے کہ زمیندار اس زمانہ میں گاؤں میں جس طرح دورے کرتے تھے۔ ضلع دار آتے تھے اور زمین داروں کی آمد پر جس طرح نذرانے تحائف اور رشوتیں وصول کی جاتی تھیں جس طرح غریب کسانوں کی پٹائی ہوتی تھی اور ان کو مرغا بنایا جاتا تھا ان تمام امور سے کتاب کے اوراق خالی ہیں۔

انسان بھوکا رہ سکتا ہے، مصائب سہہ سکتا ہے مگر اپنی بیٹی بیوی اور بہو کی آبرو ریزی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی کسان کے سامنے دو طرز کے استحصال تھے ایک معاشی اور دوسرا جنسی ان دونوں میں وہ مجبور تھا۔ پریم چند چونکہ اس کسان کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو صدیوں سے مجبور ہے۔ جس کی محنت پر ضلع دار کا رندے اور زمیندار کا قبضہ ہے۔ اس میں انھوں نے جنسی استحصال بالجبر کا ذکر نہ کر کے در اصل ایک نہایت بھیانک اور اذیت ناک منظر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کو میں کتاب کی حقیقی خامیوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس دور کے ہندوستانی کسان کی داستان یقیناً نامکمل ہے بغیر اس ظلم عظیم کے ذکر کے جو اس جاگیر دارانہ ماحول میں ایک کھلا ہوا راز تھا۔ جو معلوم عوام تھا۔ اس بے عزتی اور جنسی ظلم کے باعث بسا اوقات کسان اپنا وطن ترک کر کے دوسرے گاؤں یعنی دوسرے زمیندار یا راجہ کے علاقہ میں جا کر بس جاتے تھے۔

جن لوگوں کو دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل سے سابقہ پڑا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ دیہاتی سماج باہمی مناقشت اور نزاعوں سے پر رہتا ہے۔

بٹی داری، رقابت، حسد، درختوں کے جھگڑے، جائیداد کی نزاعات اور نالیوں کے بارے میں لڑائی، باہمی پارٹی بندیاں اور اس قسم کے عناصر دیہاتی زندگی میں اہم رول ادا کرتے ہیں مگر گئودان میں ان کا کوئی ذکر نہیں، میلے اور بازاروں کا تذکرہ نہیں۔ دیہاتی سماج کے ان مناظر کی تصویر کشی آسانی سے ہو سکتی تھی۔ اگر ناول میں شہری عناصر کو جگہ نہ دی جاتی۔

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنّف کا مقصد ایک دیہاتی خاندان اور ایک کسان کی زندگی کی ترجمانی تھا جس کو اس نے نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے جس میں کھلیان کا دلچسپ منظر، چوپال کی چہل پہل کھیتوں کی ہریالی، غریبوں کی آرزوؤں کی تصویریں، مالداروں کی سازشیں اور ہلکے پھلکے دیہاتی جھگڑے بڑی کامیابی سے پیش کیے ہیں۔ خاص طور سے ناول کا خاتمہ نہایت اثرانگیز اور دلکش ہے، اس میں حقیقت، آرزو، ایک غریب کسان کے وقت آخر کا منظر غیر معمولی طور پر مؤثر اور حیرت انگیز طور پر فنکارانہ ہے۔ جس میں پریم چند کی پوری عمر کا تجربہ، مشاہدہ اور فنی مشق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے گوبر کا لڑکا لکھنؤ میں مر جاتا ہے مگر اس کا کوئی اثر ہوری اور دھنیا پر نہیں دکھایا گیا ہے حالانکہ دیہاتی زندگی میں اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خیر یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔

پریم چند نے کبھی ہوری کا گھر گرتے یا ٹپکتے نہ دکھایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا گھر بڑا آرام دہ تھا۔ جس میں اس نے مزید زمین بھی ملالی تھی۔ اس کی بیگار اور خوشامد کے باعث رائے صاحب

اس سے کوئی مواخذہ نہ کرتے تھے۔

دیہاتی زندگی میں تخمی آم کے باغوں کا لطف عجب دلکش ہوتا ہے۔ایک جگہ آم کے بوروں کی مہک کا تذکرہ ہے مگر آم پھلنے پر دیہاتی کس طرح باغوں میں رہتے ہیں اور معاشی طور پر کس طرح یہ زمانہ ان کے لیئے آرام دہ گذرتا ہے۔اس کا ذکر اگر ہوتا تو ہندوستانی دیہاتوں کی تصویر اور نکھر آتی ہے۔

ساس اور بہو کے جھگڑے اور عورتوں کی لڑائیاں دیہاتی زندگی اور خصوصاً کسانوں کے طبقہ میں عام ہیں یہاں تو دھنیا اور جھنیا تک میں لڑائی نہیں دکھائی گئی ہے۔حالانکہ ساس و بہو کے جھگڑے تو روایتی اور معروف ہیں۔

گوبر ہوری اور دھنیا کے تعلقات نہایت پر تکلف معلوم ہوتے ہیں جیسے ہوری کو بیٹے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

ان امور کو میں نے اپنے دیہاتی زندگی کے مشاہدہ کے باعث پیش کیا ہے ورنہ ان کو میں گئودان کے عیوب میں شمار نہیں کرتا۔میں نے اس خیال سے ان باتوں کا ذکر کر دیا کہ اگر گئودان سے شہری کردار نکال دیئے جائیں تو۔ان تمام امور کا تذکرہ جو دیہاتی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں پوری طرح ممکن ہو جاتا اور ترجمانی بھرپور ہو جاتی پھر بھی ان باتوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی معاشی و سماجی زندگی کی ترجمانی تو مکمل کی گئی ہے۔

ہوری :-

جہاں تک گئودان کے کرداروں کا سوال ہے ان میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں دیہاتی کردار نہایت مکمل ہیں ان میں جزئیات نگاری اور تفصیلات ہیں ان کے مطالعہ سے دیہاتی زندگی کی معاشرت کے نقشے نگاہوں میں مصوّر ہو جاتے ہیں۔ ان کرداروں میں سب سے مکمل کردار ہوری کا ہے۔ ہوری ایک مصلحت پسند اور ہوشیار کسان ہے وہ رائے اگرپال سنگھ کے پاس جا کر گھنٹوں بیگار کرتا ہے۔ خوشامد کرتا ہے۔ مشورے دیتا ہے اور اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ اس کا مقصد اس سے محض یہ ہوتا ہے کہ زمیندار اس کے ساتھ رعایت کرے اور لگان وغیرہ میں سختی نہ کرے۔ چنانچہ جب اس کا لڑکا گوبر کہتا ہے کہ آپ مالکوں کی خوشامد کیوں کرتے ہیں، دھنیا بھی کہتی ہے کہ یہ روز روز خوشامد سے کیا فائدہ؟ تو ہوری ان کو بتاتا ہے کہ ہماری حاضری کے باعث فلاں فلاں رعایتیں ہم کو ملی ہیں ورنہ کل ہی کا زندہ آجائے اور مطالبے کرے۔

وہ قدیم دور کا پروردہ ہے وہ توہم پرست ہے وہ راضی برضا رہنے کا قائل ہے وہ امارت وغربت کو تقدیر کا فیصلہ تصوّر کرتا ہے وہ صاف کہتا ہے کہ امیر اور غریب لوگ اس بنا پر ہیں کہ انھوں نے پہلے جنم میں اچھے اور بُرے کام کئے تھے۔ وہ گوبر سے کہتا ہے کہ زمیندار کے خلاف باتیں کرنی لاحاصل ہیں اسلئے کہ ان بڑے لوگوں نے پہلے جنم میں اچھے کام کئے تھے جس کے بدلہ میں ان کو اس جنم میں خوشی کے مواقع ملے ہیں۔ یہ وہی خطرناک

نظریہ ہے جس نے ذات پات کی جڑوں کو ہندوستان کے طول و عرض میں مضبوط کر رکھا ہے اور اس ملک میں غیر مسلم معاشرہ کا یہ ایک بنیادی اور جوہری عنصر ہے جس کے مظاہر ہندوستانی کلچر کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔ اگرچہ پریم چند نے گوبر کی زبان سے ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے مگر مناسب یہ تھا کہ وہ کسی کردار سے اس پورے نظریہ اور اس کے بھیانک اثرات کی مکمل تردید کرتے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا اس لئے کہ وہ خود بھی نظریۂ تناسخ کے قائل تھے۔

ہوری کے کردار میں انسانی نفسیات کی بڑی عمدہ تصویریں ملتی ہیں۔ اس نے چودھری کے ہاتھ ۲۰ روپیے سیکڑے میں بانس بیچے اور چودھری سے کہا کہ تم میرے بھائیوں سے کہنا کہ ۱۵ روپیے سیکڑہ میں بانس بکے ہیں۔ اس طرح وہ چاہتا تھا کہ ڈھائی روپیہ اس کو بھائیوں سے زیادہ مل جائے۔ ہیرا کی عورت لڑنے لگی کہ بانس کی رقم کم لگائی گئی ہے۔ ہیرا نے آخر چودھری سے کہہ دیا کہ جو تجھ دادا نے کہا ہے وہی کرو یعنی ۱۵ روپیے سیکڑے میں بانس کاٹ لو۔ چودھری ایک چالاک شخص ہے۔ اس نے جب پیسے دیئے تو وہی ۱۵ کے حساب سے ہوری نے ڈھائی روپیے اور مانگے تو اس نے دھمکی دی کہ اگر تم نے مطالبہ کیا تو میں تمہارے بھائیوں سے کہہ دوں گا کہ تم نے ان کا حق اس طرح مارنے کی ترکیب کی تھی مجبوراً ہوری خاموش رہ گیا اور اس ناکامی پر نادم ہوا۔

ہوری باوجود نظریۂ تناسخ پر یقین کے اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ سرمایہ دار ہمارا خون چوس رہے ہیں وہ کہتا ہے کہ " ہمارا جنم اس لیئے ہوا ہے کہ اپنا لہو بہادیں اور بڑوں کا گھر بھر دیں"۔

اس کو اپنی خاندانی عزت کا پاس ہے۔ جب اس کا بھائی ہیرا گائے کو

زہر دیتا ہے تو وہ اس امر پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے قرض لیکر تھانیدار کو دیدے اور اپنے بھائی کو رسوائی سے بچالے۔ وہ ہر موقع پر خاندانی وقار کی حفاظت کیلئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ جب ہیرا گھر سے اسی جرم میں بھاگ جاتا ہے تو وہ اس کی عورت پُنیا کی پوری مدد کرتا ہے۔

وہ اپنی بیوی دھنیا سے ہمیشہ مرعوب رہتا ہے اور اس کے ڈر سے من مانی نہیں کر پاتا۔ دھنیا عموماً انصاف پسندی سے کام لیتی ہے اور ہوری خود بھی بڑی حد تک انصاف پسند اور نرم طبیعت کا انسان ہے۔ ہوری کا بنیادی فکر یہ ہے کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے ترکہ کی حفاظت کرے۔ اُسکے نزدیک یہ ترک خاندانی وقار، جائیداد اور دھرم پر مشتمل ہے وہ تین چار بگھے زمین کو پوری عمر سینے سے لگائے رہا ان کو کبھی نہ بیچا۔ فاقے کئے تکلیفیں اٹھائیں مگر اپنے ترکہ میں کسی پہلو پوری عمر آنچ نہ آنے دی۔

ویسے وہ وسیع النظر کسان ہے ورنہ اتنا روایت پرست کسان کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اپنے گھر میں سلیا جیسی عورت کو پناہ دے جو سوسائٹی میں بدنام تھی اور جو چمار کی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ بڑی ہمت اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً اس معاشرت میں جو ذات پات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہو۔ وہ اپنے انھیں وسیع تصور کے ماتحت گوبر کے جھنیا سے عشق کو بُرا نہیں تصور کرتا۔ وہ ناجائز تعلقات کو بُرا نہیں سمجھتا اور جھنیا کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور اپنی بہو بنا لیتا ہے۔

پریم چند سے یہاں یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے ہوری کی ذات ظاہر نہیں کی دوسرے یہ کہ انھوں نے اس مشہور و معروف رواج کا ذکر بھی

نہیں کیا کہ جب اس قسم کے ناجائز تعلقات نچلے طبقہ کے ہندوؤں میں ظاہر ہوتے ہیں تو اس ذات کے لوگ یعنی برادری "نجات" طلب کرتی ہے یا پھر اس کو گیا یا بنارس کہیں یاترا کرنے جانا پڑتا ہے۔ تب وہ اپنی برادری کے اندر داخل ہوتا ہے ورنہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ پریم چند نے ان حرکتوں سے ذات باہر ہونے کا تھوڑا سا ذکر ماتادین کے معاملہ میں تو کیا ہے۔ مگر گوبر کے سلسلہ میں اس مسئلے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ جس دیہاتی زندگی اور معاشرہ کا وہ ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے کسی عورت کو جو ذات باہر ہو کوئی اپنے گھر میں رکھ نہیں سکتا ورنہ اس کا حقہ پانی بھی بڑھ جاتا ہے اور اس کو بھات دینا پڑتا ہے یعنی پوری برادری کی دعوت کرنا ضروری ہوتا ہے۔

⁕ ہوری باوجود ان خوبیوں کے بھولا اہیر کو دھوکہ دیتا ہے۔ وہ اس کو غرض مند سمجھ کر جھوٹ وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ اسکی شادی کرا دے گا۔ دراصل اس کے اندر وہ تمام خوبیاں اور خامیاں ہیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں اور میرے خیال میں یہی اس کا امتیاز بھی ہے۔ وہ محنتی جفاکش، وفادار اور صاحب غیرت ہے۔ جب وہ کھیت رہن کر دیتا ہے اور داتادین کے یہاں مزدوری کرنے جاتا ہے تو داتادین زیادہ تیزی سے کام کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اس پر ہوری بغیر کسی حجت کے تیزی سے کام کرتا ہے فاقہ اور کمزوری کے باعث اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر وہ کثرت کار کے باعث بیہوش ہو جاتا ہے۔

اس میں ظرافت بھی ہے جب اس کی ملاقات میں گاؤں کی ایک مالدار

خاتون جو دو کان رکھتی ہے۔ سٹھانی دولاری سے ہوتی ہے تو وہ ان سے خوش گپیاں کرتا ہے۔ مذاق کرتا ہے اور دولاری کو وہ جوانی کے دن یاد دلاتا ہے۔ جب کہ وہ اس کے دروازے کا چکر لگایا کرتا تھا۔ دھنیا اسکی اس حرکت سے بہت جلتی تھی اور اسی چکر میں رہتی تھی کہ ہوری سٹھانی کے پاس نہ جانے پائے چونکہ ہوری بیوی سے ڈرتا تھا اسلیئے جہاں اس نے بلایا وہ فوراً سٹھانی کے پاس ڈر کر بھاگ آتا تھا۔

بیلاری کا یہ ۴۰ سالہ کسان بہ ظاہر ایک منفی کردار ہے۔ جو مخصوص اخلاق اور مذہبی قدروں کا قائل ہے مگر جیسے جیسے یہ کردار آگے بڑھتا ہے۔ اس میں معاشرتی زندگی کے مسائل ابھرتے ہیں زندگی کی پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں۔ دیہاتی زندگی اور ہندوستان کے سب سے بڑے طبقے کے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کراتے ہیں۔

اس کے کردار میں مجبوری، ناداری اور ناتمام آرزوئیں قاری کے دل کو متاثر کرتی ہیں وہ ایک گائے کی آرزو رکھتا ہے۔ مگر اس کا یہ ارمان کبھی پورا نہیں ہوتا۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب اس کو گائے مل جائے گی مگر یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔

یہاں پریم چند نے یہ واضح نہیں کیا جب ہوری نے اپنی چھوٹی لڑکی روپا کی شادی ایک ادھیڑ آدمی سے اس بنا پر کردی کہ وہ مالدار تھا اور کتاب میں یہ ذکر بھی آیا کہ روپا ایک گائے دے گی پھر اس کے بعد یہ معاملہ غائب ہو گیا اور باوجود دولت مندی کے روپا اپنے بوڑھے

باپ کو ایک گائے کیوں نہ ہدیہ کر سکی؟ اس مسئلہ کو پریم چند نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ غالباً وہ بھول گئے۔ اس گائے کی آرزو کو پریم چند نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

"ہوری قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف ایکھ کی لہراتی ہوئی ہریالی کو دیکھ کر اس نے دل میں کہا بھگوان کہیں برکھا کر دیں اور سب بڑھی ٹھیک ہیں تو ایک گائے ضرور لے گا اس کی پوری سیوا کرے گا کچھ نہیں تو چار یا پانچ سیر دودھ ہو گا۔ گوبر دودھ کیلئے ترس کر رہ جاتا ہے اس عمر میں نہ کھایا تو پھر کب کھائے گا۔ سال بھر دودھ پا جائے تو دیکھتے بنے"

ہوری ایک ایسا کسان ہے جو کبھی زراعت کرتا ہے اور کبھی مزدور بن جاتا ہے اور تعجب ہے کہ وہ کبھی اپنے بیٹے گوبردھن کی نالایقی کی شکایت نہیں کرتا۔ وہ کبھی اپنے بھائی کی بیوفائی کا شاکی نظر نہیں آتا۔ اس نے پوری عمر اپنے بھائی کا خیال رکھا۔ اس نے پیسے کی مجبوری سے چھوٹی لڑکی کی شادی ایک بوڑھے سے کر دی۔ اس کی موت کا منظر پریم چند نے بہت حقیقی اور بہت جاندار دکھایا ہے۔ بھولا اہیر جب گائے کے بدلے میں اس کے بیل کھول لے جاتا ہے تو ہوری اس کے خلاف صرف خاموشی اختیار کرتا ہے۔ حالانکہ گاؤں والے دوڑ کر ہوری کے بیل اس سے چھین لیتے ہیں مگر ہوری کہتا ہے کہ اگر بھولا کا دھرم یہی کہتا ہے تو اس کو لے جانے دو اس پر گاؤں والے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہوری کی انصاف پسند طبیعت اور

نفسیات کام کرتی ہے اس کو خوب علم ہے کہ اس نے دھوکہ سے بھولا کی خوبصورت گائے لے لی تھی۔ اب جب وہ اس کے بدلے میں بیل لے جانے لگا تو اس غربت کے باوجود ہوری نے اس کے اقدام کو مناسب تصور کیا۔ حالانکہ وہ تخم ریزی کا زمانہ تھا۔ اسی وقت بھولا نے بیل لیکر ہوری کو سخت نقصان پہونچایا۔ ہوری بامروت آدمی تھا۔

" دھنیا اور ہوری کے تعلقات بھی بہت سے نفسیاتی عقدے رکھتے ہیں دھنیا اکثر معاملات میں ہوری سے اختلاف رکھتی ہے۔ وہ جراءت مند ہے وہ معاملات میں صحیح رائے قائم کرتی ہے۔ چونکہ ہوری اپنی ہمدردی، مروت اور محبت کے باعث اکثر لوگوں کی بیجا حمایت کرتا ہے۔ بھائیوں کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں اکثر دھنیا سے اور ہوری سے لڑائی ہو جاتی ہے اور ایک بار تو ہوری نے اس کو مارا بھی۔ الغرض دھنیا کی رائے کا وہ احترام کرتا تھا اور اکثر فیصلوں میں اس کی رائے کے اثرات ہوری پر پڑتے تھے۔

میری نظر میں اس کی عظمت کا بڑا راز اس کے اس احساس میں ہے۔ جو باوجود روایت پرستی کے اس کے اندر معاشی استحصال کا شعور اجاگر کر رہا تھا۔ جس سے اس نے باوجود مکتی اور جنم کے نظریہ پر یقین کے کئی بار یہ اعلان کیا کہ یہ بڑے اور مالدار ہمارا خون چوستے ہیں۔

ہیرا نے ہوری سے کہا کہ "تم بھی تو بہت دبلے ہو گئے ہو دادا"

"ہوری نے ہنس کر کہا "تو کیا یہ میرے موٹے ہونے کے دن ہیں؟ موٹے وہ ہوتے ہیں۔ جنہیں نہ روپیے کا سوچ ہوتا ہے نہ مرجاد کا۔

اس جگ میں موٹا ہونا بے حیائی ہے سو کو دبلا کر کے تب ایک موٹا ہوتا ہے۔
ایسے موٹاپے میں کیا سکھ؟ سکھ تو تب ہے کہ سبھی موٹے ہوں" (ص ۲۹۵)

ہوری کے کردار کی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں پر فدا ہے اور بھائی اس کے دشمن جانی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بھائی جن کو دست و بازو ہونا چاہیئے عام طور سے حسد و بغض میں مبتلا ہو کر اپنے ہی بھائی کو نقصان پہونچانا چاہتے ہیں۔ ہوری نے ہیرا کیلئے پوری عمر قربانی کی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کو بچپن سے پالا اس کی شادی کی اس کو پیسے دیئے اور ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بدنفس نے ہوری کی گائے کو محض دشمنی اور حسد سے زہر دیدیا اور وہ مر گئی۔ ایک طرف یہ انسانیت سوز برتاؤ ہے۔ دوسری طرف ہوری کا اعلیٰ کردار ہے۔ اس نے اپنی آنکھ سے وہ زہریلی بوٹی گائے کو کھلاتے ہوئے دیکھا۔ جس سے وہ مر گئی اور یہ واقعہ خود اس نے دھنیا سے کہا مگر جب معاملہ گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کے سامنے پیش ہوا تو چھوٹے بھائی ہیرا کی مدافعت میں اور اس کی آبرو بچانے کیلئے برسر عام اکلوتے بیٹے گوبر کی قسم کھا گیا کہ میں نے ہیرا کو زہر دیتے نہیں دیکھا۔ جب بار بار دھنیا نے اعلان کیا کہ خود ہوری نے اس سے ہیرا کے زہر کھلاتے کا واقعہ بیان کیا تو اس نے اس پیکر وفا اور مجسمۂ شرافت و شفقت کو برسر عام خوب مارا اتنا مارا کہ وہ بے دم ہو گئی۔

یہ ہوری کی روایتی کمزوری ہے۔ اس سماج کی کمزوری ہے اور اس ماحول کی غیر شعوری تربیت ہے جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس لئے بھائی کی اور خاندان کی بے عزتی کبھی اور کسی قیمت پر برداشت نہیں کی۔ وہ

بال بچے سب اس راہ میں قربان کرنے کو تیار نظر آتا ہے مگر اس کے برعکس ایک بھائی اس کے دشمن جاتی ہیں جو ہر موقع پر اس کو نیچا دکھانے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں۔

یہ محض ہیرو ہوری کی داستان نہیں ہے کتنے گھر اور کتنے خاندان اس طرح کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہیں بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ وہ اسے کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتا۔ ان" برادرانِ یوسف" کی ترجمانی" ہیرا" کے کردار سے کی گئی ہے۔

جب ایک بھائی حسن سلوک کرے اور دوسرا بھائی بدسلوکی پر آمادہ ہو تو عموماً بھاوج (حسن سلوک کرنے والے کی بیوی) سلوک کرنے کے مخالف بن جاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ رقم بجائے دیور یا جیٹھ کے خود اسکے بچوں پر صرف ہوگی۔ یہ ایک فطری امر ہے مگر حسن سلوک کرنے والا گر گذرتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ دھنیا اس قسم کی بھابی ہے جو ہیرا سے حسن سلوک کی مخالف ہے اس کی وجہ" ہیرا" کی بے وفائی، خبثِ نفس اور بدسلوکی ہے۔ خود دھنیا نے بچپن سے اس کی پرورش کی۔ ہوری تادمِ آخر اس پر مہربان رہا مگر وہ خواجہ سگ پرست کے بھائیوں کی طرح کبھی اپنی بدنفسی سے باز نہیں آتا تھا۔

دلاری بڑھاپے میں بیویوں کی بدسلوکی سے عاجز ہو کر ایک جوان عورت سے شادی کر لیتے ہیں تاکہ انھیں وقت پر کھانا پینا مل سکے مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ بوڑھے اور عورت بالکل جوان نتیجہ کیا ہوگا۔ جب اس پر نوکھے رام قبضہ کر لیتے ہیں تو وہ ہوری سے ہیری کی شکایت کرتا ہے وہ اس کو مشورہ دیتا ہے کہ

وہ نہری کو چھوڑ دے۔ یہ مشورہ فی نفسہ صحیح تھا مگر وہ ایسا پھنسا تھا کہ نہ چھوڑ پاتا تھا نہ پکڑنا ممکن تھا۔ یہاں ہوری کا یہ کردار سامنے آتا ہے کہ ایک طرف وہ دلارے کو یہ مشورہ دیتا ہے اور دوسری طرف نہری سے وہ خوشامدانہ باتیں کرکے ۱۰۰ روپیے ادھار مانگ لاتا ہے۔ حالانکہ وہ نہری کے انداز کو نہایت ناپسند کرتا ہے مگر اپنی غرض کیلئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔

"جھنیا" کے سلسلے میں جب گاؤں والے اس پر ۱۰۰ روپیے اور ۳۰ من غلّہ کا جرمانہ لگاتے ہیں تو وہ برادری اور گاؤں والوں کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے مگر دھنیا کہتی ہے کہ دیکھوں گی کہ کون ایک دانہ بھی ہمارے بچوں کے رزق میں سے لے جاتا ہے مگر بالآخر ہوری پنچایت کے فیصلے کا احترام کرتا ہے جب رائے صاحب وہ جرمانہ خود لے لیتے ہیں اور سرغنوں کو کھائی رقم واپس کرنی پڑتی ہے تو اس وقت ہوری اور دھنیا دونوں خوش ہوتے ہیں۔ اس سے ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جرمانہ برادری نے نہیں کیا تھا بلکہ گاؤں کے لیڈروں نے سازش سے کیا تھا اور یہ صحیح نہ تھا لہذا رائے صاحب نے اس پر اعتراض کرکے رقم خود ہڑپ کر لی۔ اگر یہ جرمانہ اس کی ذات کی برادری کرتی۔ جس سے ہوری کا تعلق تھا تو پھر رائے صاحب اعتراض نہ کرتے اس لئے کہ اس کی حیثیت مذہبی ہوتی ہے دوسرے یہ کہ برادری صرف کھانا کھاتی ہے یا معمولی جرمانہ کرتی ہے۔ اتنی رقم وصول نہیں کرتی۔ پریم چند کے دور میں ۱۰۰ روپیے آجکل کے ہزاروں کے برابر ہوں گے۔

دراصل پریم چند "بھات" دینے کی رسم سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں نیچی ذاتوں میں اجتماعی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ جس میں پوری برادری کو کھانا کھلانا ہوتا ہے

وہ اپنے ترکہ کی حفاظت کے لئے دو سو روپے روپا کے شوہر سے لیکر اپنے کھیت بچا لیتا ہے حالانکہ دھنیا اس امر پر شرم محسوس کرتی ہے کہ بیٹی کو دینے کے بجائے اس سے اُلٹا روپیہ وصول کر لیا جائے مگر ہوری اس انداز سے سوچتا ہے کہ اس کا آبائی سرمایہ یہی چند بیگھہ زمین ہے اگر اس طرح وہ بچ جاتی ہے تو بچا لینا چاہیے۔ وہ روپئے لے کر ان سے اپنے کھیتوں کو بچاتا ہے۔ یہ اس کی نفسیات کا اظہار ہے۔

وہ سیدھی طبیعت کا آدمی ہے بغاوت اس کی فطرت میں ذرا بھی نہیں۔ جب نوکھے رام گوبر سے ناراض ہو کر اس کو بلاتے ہیں اور دوبارہ لگان مانگتے ہیں تو وہ ڈر جاتا ہے اور دینے پر آمادہ سا نظر آتا ہے مگر گوبر جا کر عدالت کی دھمکی دیتا ہے تو نوکھے رام اقرار کرتے ہیں کہ لگان ادا کیا جا چکا ہے۔

ہوری بہادر طبیعت کا انسان ہے جب مہتا مذاق میں خان بن کر بندوق سے سب کو ڈراتے ہیں تو وہ خان صاحب پر چڑھ بیٹھتا ہے اور اٹھا کر پٹک دیتا ہے۔ خاں صاحب چت ہو جاتے ہیں تو ان کی داڑھی پکڑ کر اکھاڑ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی صاحب ہمت آدمی کے بس کی بات ہے۔

ہوری مظلوم، روایت پرست، صدیوں سے ظلم و جہل کا شکار اور محرومیٔ لذت حیات میں مبتلا ہندوستانی کسان کی صحیح تصویر ہے۔ پریم چند نے کسی بڑے کسان کو منتخب نہیں کیا۔ اسلئے کہ متمول کسان بھی چھوٹے کسانوں کو لوٹنے کی کوشش کرتا ہے اور سرمایہ داروں کے استحصال میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ہوری سے بہتر کردار ہندوستان کے کروڑوں کسانوں کی ترجمانی کیلئے ملنا مشکل ہے۔ ہمارے ادب کے ذخیرہ میں اور ناولوں کے کرداروں میں یہ ایک ہیرا ہے جو ہمیشہ چمکتا رہ

دھنیا :-

ہوری اور دھنیا کا نقطہ شروع ہی میں واضح ہو جاتا ہے۔ ہوری زمیندار کے یہاں جاکر اپنی سعادت مندی ظاہر کرتا اور خوشامد کرتا ہے مگر دھنیا اس کے اس عمل کو بے حد ناپسند کرتی ہے۔ وہ صاف کہتی ہے کہ لگان ادا کرنے، نذرانہ دینے اور بیگار کرنے کے بعد خوشامد کرنے اور حاضری دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ ظلم کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ وہ ظالموں سے نفرت کرتی ہے۔ ان کو برا بھلا کہتی ہے اور اپنی غربت و افلاس کا ذمہ دار انھیں سرمایہ داروں کو قرار دیتی ہے جو زمیندار کارندے مہاجن اور مذہبی پیشواؤں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان کی خون پسینہ کی کمائی غصب کرتے جاتے ہیں۔ وہ ایک تیز زبان عورت ہے جو ظلم پر بڑبڑاتی ہے۔ اس کے برعکس ہوری صابر و شاکر طبیعت کا انسان ہے جو سرمایہ داروں سے نفرت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اسکی نظر میں یہ سرمایہ اور دولت ان کو ان کے پچھلے اعمال کی بنا پر ملی ہے۔ دھنیا اعلان کرتی ہے کہ داتا دین، منگرو شاہ، نوکھے رام اور جھنگری سنگھ سب لٹیرے ہیں جو غریبوں، کسانوں اور ناداروں کا خون چوستے ہیں۔

جب جھنگری سنگھ اپنے مطالبے کے بدلے میں ایکھ کا کھیت کٹا لیتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ سینچا گوڑا ہم نے محنت ہم نے کی اور مزا اڑایا جھنگری سنگھ نے۔ ان مواقع پر قدرتاً آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ

محنت کس کی اور فائدہ اٹھاتے کون ہیں؛ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ مقروض کا سارا سرمایہ "کھیت" ہی ہو جسکو بیدردی سے کٹوا لیا جائے ۔۔ وہ ہوری کے دبو پن، سیدھی طبیعت، رسومیت پرستی اور جھگڑا بڑھانے کے انداز کی شاکی ہے۔ جب اس کے دیور ہیرا کے گھر کی تھانیدار تلاشی لینے کی دھمکی دیتا ہے اور گاؤں کے سربرآوردہ اشخاص تھانیدار کو رشوت دینے اور اس میں سے کچھ روپیے خود باہم بانٹ لینے کی سازش کرتے ہیں اور جھنگری سنگھ فوراً تیس روپے سودی کا پیش کر دیتے ہیں تو وہ کہتی ہے۔ "ہم باکی چکانے کو بیس روپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا آج انجلی بھر روپیے ٹھنّاٹھن نکال کر دے دیئے۔ میں سب جانتی ہوں یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا" اس سے قبل وہ جھپٹ کر آئی اور انگوچھا ایک جھٹکے کے ساتھ ہوری کے ہاتھ سے چھین لیا۔ گانٹھ مضبوط نہ تھی جھٹکے کے زور سے کھل گئی اور سارے روپے زمین پر بکھر گئے۔ پھر وہ کہتی ہے "گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو مریں، پیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپیہ لیکر چلا ہے۔ اجت بچانے![1] اس کی دانش مندی سے بیس روپیہ بچ جاتے ہیں۔ اور گاؤں کے سرغنہ شرمندہ ہوتے ہیں ۔۔۔ وہ ایک رحم دل عورت ہے جھنیا اور سلیا کو اپنے گھر میں رکھ لیتی ہے ان کے سلسلہ میں برادری کا لحاظ نہیں کرتی اور ان کی مشکلات کو سمجھتی ہے۔ جھنیا کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس نے گوبر کو بہکایا تھا ورنہ گوبر کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ تصور اپنے بیٹے کی صفائی اور اپنی بہو کے بغض میں قائم کیا ہو۔ وہ ساس ہے اس کو بہو سے پرخاش بھی ہے۔ مگر دیہاتوں میں جتنے جھگڑے اس خاص رشتہ میں رونما ہوتے ہیں ان کی تصویر کشی پریم چند نے نہیں کی

[1] گئودان ص ۱۸۶

چونکہ جھنیا کے دو نندیں بھی تھیں سونا اور روپا ان سے جھنیا کی کشمکش ہونی ضروری تھی مگر اس کا بھی کوئی منظر نہیں پیش کیا گیا۔ اسکی وجہ غالبًا گوبر کی شہر کی رہائش ہے مگر ان دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کے بغیر دیہاتی معاشرے کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی۔

دھنیا ایک عزت مند عورت ہے وہ رقیب برداشت نہیں کر سکتی جب کبھی ہوری سٹھانی دلاری کے یہاں جاتا ہے۔ دھنیا اس کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کا اس سے ہنسی مذاق وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ جہاں اس نے دولاری کی دوکان پر دیر لگائی وہاں دھنیا پہونچی۔ چونکہ ہوری دل سے اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کمزوری سے وہ واقف تھی اس لئے وہ دھنیا سے مرعوب ہے۔ وہ اس کی کمزوری کے باعث اس کی خبر لیتی ہے۔

وہ ایک وفا شعار ہندوستانی عورت ہے جو شوہر کیلئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے وہ اس کی مرضی کیلئے مشکلات برداشت کرتی ہے۔ وہ ان امور کو بھی انگیز کرتی ہے جن کو صحیح تصور نہیں کرتی۔ ہوری ہیرا کیلئے اس کو سب کے سامنے مجمع عام میں خوب پیٹتا ہے مگر وہ اس کی محبت کبھی دل سے نہیں نکالتی۔ اس کو عورتوں کی ذلت اور ان کے پچھلے ہونے کا پورا احساس ہے۔ مگر قدرت نے اس کو جس ماحول اور جس معاشرہ میں پیدا کیا ہے۔ اس کو وہ صبر و شکر کے ساتھ انگیز کرتی ہے اور اپنی محبت سے شوہر اور بچوں کی خدمت کرتی ہے۔ مزدوری میں جب ہوری ضرورت سے زیادہ محنت کرتا ہے تو وہ اسکی صحت سے ڈرتی ہے اور کہتی ہے کہ اعتدال سے کام کرو اپنی صحت خراب نہ کرو۔ جب وہ بیمار ہو جاتا ہے اور مرض الموت

میں مبتلا ہو جاتا ہے تو دھنیا غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ کبھی کچا آم بھون کر اس کا شربت بناتی ہے اور کبھی کوئی اور دوا کرتی ہے اس پر ہوری کہتا ہے۔

"میرا کہا سنا معاف کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں۔ گائے کا ارمان من ہی میں رہ گیا اب تو یہاں کے روپیے کریا کرم میں لگ جائیں گے رو مت دھنیا اب کب تک جلائے گی؟ سب طرح کی درگت تو ہو گئی۔ اب مرنے دے۔"[1]

کتاب کے خاتمہ پر دھنیا کی تصویر غیر معمولی طور پر شوہر کی محبت و وفاداری کی ترجمان بن کر ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی غربت اور بے بسی کے نظارے بھی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں دو ٹکڑے جو بڑے جاندار ہیں پیش کیے جاتے ہیں۔

"مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا اُمید کے مٹے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پنا بناتی اور کبھی ہوری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی، کیا کرے پیسے نہیں ہیں ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بلاتی۔ دھنیا مشین کی طرح اٹھی آج جو ستلی بیچی تھی اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتادین سے بولی مہراج: گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں یہی ان کا گئودان ہے، اور غش کھا کر گر پڑی"[2]

اس میں شوہر سے تعلق کی کتنی سچی تصویر ہے۔

---

[1] گئودان ص ۵۹۵ - ۵۹۶

گوبردھن :-

گوبر پہلے تو ایک سیدھا سادا نوجوان نظر آتا ہے۔ لکھنؤ جاکر اس کی سعادت مندی میں اضافہ ہوتا ہے وہ پیسے بھی کماتا ہے گھر کچھ سامان بھی لاتا ہے۔ وہ شہر میں نئے خیالات سے متاثر ہوکر لوٹتا ہے تو گاؤں کے نوجوانوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک ناٹک کرتا ہے۔ جس میں لالہ پٹیشوری جھنگری سنگھ نوکھے رام اور گاؤں کے تمام سرغنوں کا خاکہ اڑاتا ہے۔ جس سے پورے گاؤں میں کھلبلی مچ جاتی ہے مگر بعد میں یہ کیفیت باقی نہیں رہ جاتی اسکی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ دوبارہ لکھنؤ گیا تو بے راہ ہوگیا اور پہلے جیسا سلیقہ مند اور پیسے پر جان دینے والا نہ رہ گیا۔ وہ پہلے تو والدین کا بڑا لحاظ کرتا تھا بھولا کے یہاں سے بیل کھول لایا مگر بعد میں بالکل بدل گیا۔

اس کا جھنیا سے عشق چل رہا تھا مگر لکھنؤ جاکر وہ اس کو بھول گیا اسکی بد اعمالی کو اس کے والدین نے برداشت کیا اور جھنیا کا راز ظاہر ہوا تو وہ ہوری کے گھر آگئی اسکو اس نے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ بعد میں باغی اور مغرور گوبر نے ہوری سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارا قرض ادا نہ کروں گا اور پھر جھنیا کو لیکر وہ لکھنؤ چلا گیا۔ لکھنؤ پہونچ کر اس نے جھنیا کے ساتھ بھی بیوفائی کی۔ اس کو شراب پی کر روز مارتا۔ اس کے خورد و نوش اور آرام و آسائش کا لحاظ نہ کرتا۔ راتوں کو مارا مارا اِدھر اُدھر پھرتا۔ غرض اس نے جھنیا کی زندگی جہنم بنا دی۔ وہ والدین کی مدد سے بھی دستکش ہوجاتا ہے۔

ہل میں اسٹرائیک ہوتی ہے۔ اس میں ہنگامہ کے درمیان گوبر کی خوب پٹائی ہوتی ہے وہ اُٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اس وقت جھنیا اس کی خدمت کرتی ہے۔ اس ٹھوکر نے اس کو اس امر کا احساس دلایا کہ یہ مصیبت اس پر جھنیا کے ساتھ بد سلوکی کے باعث پڑی ہے۔ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ مصیبت کے بعد اکثر آدمی کو ہوش آجاتا ہے۔ اس واقعہ سے اس کی زندگی میں انقلاب آیا۔ اس نے جھنیا کی طرف توجہ کی اور والدین کی جانب بھی ملتفت ہوا مگر قبل اسکے کہ وہ ہوری کے ساتھ کوئی سلوک کرے ہوری۔ دوسری دنیا میں جا لیتا ہے۔ دھنیا اور ہوری اس کی بے التفاتی کے شاکی نہیں نظر آتے بلکہ ان کا نظریہ عام والدین کے برخلاف یہ ہے کہ گوبر جہاں رہے خوش رہے۔ یہ معاملہ پریم چند نے خلاف حقیقت لکھا ہے ہوری کو شکایت ہونی چاہئے تھی۔

گوبر ان نوجوانوں کا نمونہ ہے جو دیہات سے شہر جاتے ہیں اور وہاں بگڑ کر شہری زندگی کی بدکرداری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب وہاں کی برائیوں کے باعث زندگی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ تب بہت کچھ ٹھوکر ان کو ہوش آتا ہے۔ روپا کی شادی میں اس کو گھر کی حالت دیکھ کر ہوری کے مصائب کا احساس ہوتا ہے وہ مدد کرنا چاہتا ہے مگر حالات کی ناسازگاری کے باعث مجبور ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ہوری کے خیالات کا تعلق ہے وہ ہوری سے بالکل مختلف ہیں۔ گوبر اس سماجی ناانصافی کے خلاف سخت ردعمل محسوس کرتا ہے جو جاگیردارانہ نظام میں اس کو نظر آرہی تھی۔ وہ تقدیر اور

ذات پات کی کٹر پسندی کا قائل نہیں۔ وہ ظالموں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ وہ جھنگری سنگھ سے صاف کہتا ہے کہ جب تم روپیہ لے چکے تو رسید کیوں نہیں دی۔ اب تم دوبارہ روپے نہیں لے سکتے، حالانکہ ہوری دے دینے کو تیار تھا۔ وہ تقدیر کے پھیر پر ایمان نہیں رکھتا اور باپ سے کہتا ہے کہ "یہ تم روز روز مالکوں کی خوشامد کرنے کیوں جاتے ہو"۔ گوبر کہتا ہے کہ "جیٹھ کے دن ہیں ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں۔ بہت اناج تو کھلیان ہی میں تل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا اور جو بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں کا ہی ہے۔ (ص ۵۸۳) اس نے شہر جاکر یہ سمجھا کہ "اپنا بھاگ خود بنانا ہوگا اپنی عقل ہمت سے کام لے کر ان تکلیفوں پر فتح پانا ہوگا کوئی دیوتا کوئی پوشیدہ طاقت ان کی مدد کرنے نہ آئے گی"۔

گوبر کا کردار جدید تصوّر آزادی، مساوات اور زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ترجمان ہے۔ مگر اس کے باپ ہوری کا کردار روایت پرستی اور قدامت کا غماز ہے۔ ہوری پرانی نسل اور اس کے تصورات کا حامل ہے مگر گوبر نئی نسل کی آواز ہے وہ شہری زندگی کے مصائب سے دوچار ہوتا ہے۔ گوبر صاف اعلان کرتا ہے کہ ان معاشی استحصال کرنے والوں سے بغاوت ضروری ہے وہ اپنے باپ ہوری سے کہتا ہے کہ:-

"نہ جانے یہ دھاندلی کب تک چلے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں۔ اس کے لیئے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے۔ اوروں کی

طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبایا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ سہا جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بال بچوں کے منہ میں جابی لگائے بیٹھا رہوں۔" (ص ۵۸۷)

گئو دان کے دیہاتی کرداروں کی رو سے یہی تین کردار ہیں، باقی دوسرے کرداروں میں تفصیلات مفقود ہیں وہ مختصر ہیں اور کسی خاص موقع سے ظاہر ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے کردار تو محض وقتی طور پر سامنے آتے ہیں۔ پریم چند نے تینوں کرداروں میں خاص طور سے دیہاتی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ اگرچہ گوبر کا کردار نیم شہری اور نیم دیہاتی بن کر رہ گیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند کو ناموں کے انتخاب کا سلیقہ بالکل نہ تھا اتنے بے ڈھنگے نام انھوں نے اپنے دیہاتی کرداروں کیلئے چنے ہیں کہ پڑھکر ذوق پراگندہ ہوجاتا ہے۔ پریم چند نے یہ محسوس نہیں کیا۔ دیہاتی نام صحیح رکھے ہیں مگر ان کو بگاڑ دیتے ہیں تاکہ تلفظ میں آسانی ہو یا پھر کسی صفت کے باعث نام رکھ دیتے ہیں جیسے منگل کو بچہ پیدا ہو تو منگلو رکھ دیا یا مرکر بچا تو عرفیت مرو ہو گئی یا چھ انگلی ہوئی تو چھنگو کہلایا وغیرہ وغیرہ، اب ان ناخوشگوار ناموں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:۔ جھنیا۔ سلیا۔ دھنیا۔ گوبر۔ کودی ہوری۔ جھنگری سنگھ۔ نوکھے رام۔ کُنتھا۔ سونا، روپا نام تو اچھے ہیں مگر دونوں بہنوں کا یہ نام تکلف ظاہر کرتا ہے۔ عادتاً یہ نام کم پایا جاتا ہے۔

داتا دین :-

دیہاتی کرداروں میں داتا دین ایک اہم رول ادا کرتے ہیں وہ ایک برہمن ہیں جو چالاک، تجربہ کار اور شاطر شکاری ہیں جو موقع پر کبھی کسی کو معاف نہیں کرتے۔ وہ سرمایہ دار اور استحصال کرنے والے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی آمدنی کے بہت سے ذرائع پیدا کر رکھے ہیں۔ وہ کاشت کاری بھی کرتے ہیں۔ سودی روپیہ بھی دیتے ہیں۔ مرنے، جینے، کتھا پڑھنے، شادی بیاہ اور گناہ کرنے۔ غرض ہر موقع پر ان کا حصہ ہے۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کے علمبردار ہیں مگر خود ان کی زندگی بے عملی اور بے نوائی کی ہے۔ ان کے یہاں لالچ کا زور ہے۔ وہ گاؤں کے سرغنوں کے ساتھ مل کر جرمانہ کرتے ہیں اور اس رقم میں خود بھی حصہ بٹاتے ہیں۔ وہ خود جوانی میں عیاش تھے۔ داتا دین کی عیاشی کا جواز وہ اس طرح پیش کرتے ہیں "داتا دین نے مہابھارت اور پرانوں سے ان برہمنوں کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی جنھوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور ساتھ ہی یہ ثابت کر دیا کہ ان سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی اور آجکل کے جو برہمن ہیں وہ اسی اولاد کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی سے چلا آرہا ہے اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں" (ص ۵۰۔۳)

داتا دین کہتے ہیں کہ اصل مذہب بازار کی چیز نہ کھانا اشنان دھیان کئے کھانا نہ کھانا اور کسی کے ہاتھ کا چھوا نہ کھانا۔ اس میں وہ

اور ان کا بیٹا دونوں پکے ہیں۔

یوں تو ناول کے دیہاتی کرداروں کے ذکر میں بار بار آپکا نام آتا ہے مگر ان کا اصل قصہ اس وقت زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ جب ان کا لڑکا ماتا دین ایک چمارن سے عشق کرتا ہے اور وہ اس چمارن کو پہلے تو گھر میں نہیں آنے دیتے لبعد میں اس کو گھر کے قریب رکھ کر اس سے مزدوروں کا کا کام لیتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے مجبور ہو کر سب چمار جمع ہوتے ہیں اور ماتا دین سے انتقام لیتے ہیں اور ماتا دین کے منہ میں ہڈی لگا دیتے ہیں۔ سلیا کی ماں کہتی ہے:۔

واہ واہ پنڈت: اچھا نیاو کرتے ہو۔ تمہاری لڑکی کسی چمار کے ساتھ نکل گئی ہوتی اور تم اس طرح کی باتیں کرتے تو دیکھتی۔ ہم چمار ہیں اسلئے ہماری کوئی اجت نہیں۔ ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے اسکے ساتھ ماتا دین کو بھی لے جائیں گے جس نے اس کی اجت لگاڑی ہے۔ تم بڑے نیمی دھرمی ہو۔ اس کے ساتھ سوؤ گے پر اس کے ہاتھ کا پانی نہ پیو گے۔ وہی چڑیل ہے کہ یہ سب سہتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو سنکھیا دے دیتی" (ص ۱۰۴)

اگرچہ برہمنوں نے ماتا دین کو برادری باہر کر دیا۔ مگر بوڑھے میاں بیٹے کی محبت میں اصول و مذہب سب کو چھوڑ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

ماتادین: تو کیا تم مجھے گھر سے نکال دو گے؟

داتا دین: داتا دین نے پدرانہ محبت سے بے قرار ہو کر کہا "ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔ بیٹا۔ دھن جائے۔ دھرم جائے۔ مرجاد جائے پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا" (ص ۱۰۵)

دوسروں کے بارے میں وہ دھرم کے معاملہ میں سخت ہیں مگر اپنے بارے میں نہ دھرم ہے نہ اس کا لحاظ۔ صرف مادی خوشحالی اور خود غرضی ان کا اصول ہے۔ وہ مذہب کی تجارت کرتے ہیں اور انسانیت کا بیوپار۔ مردے سے کفن کھسوتے ہیں اور بیمار سے روپیہ مارتے ہیں۔

مذہب کے نام پر بیوقوف بنانے کا یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ ہر سوسائٹی میں ایسا ایک طبقہ ہے جو مذہب کے ذریعہ روزی کماتا ہے۔ یہ طبقہ توہم پرست دیہاتیوں، جاہلوں اور خود تعلیم یافتہ طبقہ کو بیوقوف بناتا ہے اور ان سے مادی و معاشی منافع حاصل کرتا ہے، داتا دین اسی قبیل کا انسان ہے، جو مذہب کے دعویٰ کے ساتھ ہوری سے اتنا کام لیتا ہے کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے جو اپنے بیٹے کے عیب کو نظر انداز کرتا ہے جو دوسروں پر جرمانے کرتا ہے جو غریبوں کا خون چوستا ہے۔ کسی کے یہاں بیماری یا موت ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کو گئودان ملے گا۔ انسانی ہمدردی کے جتنے مواقع ہیں، ان سے وہ اپنے پیٹ کا انتظام کرتا ہے۔ پریم چند نے بڑی ہشیاری سے داتا دین کے کردار میں برہمن کے پیشہ کو مصور کر دیا ہے جو ذات پات، بے جا تعصب اور استحصال کا صدیوں سے مصدر رہا ہے وہ اس پیشہ کی برائیاں داتا دین کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں:۔

"داتا دین داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے" میرے پاس کچھ نہ سہی میں بھیک مانگتا ہوں پر میں نے اپنی لڑکیوں کے بیاہ میں پانچ پانچ سو دیے ہیں پھر لڑکے کے لیے پانچ سو کیوں نہ مانگنا، کسی نے سینت میں میری لڑکی بیاہ دی

ہوتی تو میں بھی سینت میں اپنا لڑکا بیاہ لیتا۔ رہی حیثیت کی بات سو تم ججمانی کو بھیک سمجھو پر میں تو اسے جمینداری سمجھتا ہوں۔ بنک گھر جمینداری مٹ جائے بنک گھر ٹوٹ جائے پر ججمانی تو انت تک بنی رہے گی۔ جب تک ہندو جات رہے گی تب تک بامہن بھی رہیں گے اور ججمانی بھی رہے گی۔ سہالگ میں آرام سے گھر بیٹھے سو دو سو پھٹکار لیتے ہیں کبھی بھاگ لڑ گیا تو چار پنچ سو مار لیے۔ کپڑے، برتن، کھانے اوپر سے۔ کہیں نہ کہیں نت ہی کام بنا رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تب بھی ایک دو تھال اور دو چار دچھنا کے مل جاتے ہیں۔ ایسا چین نہ جمینداری ہی میں ہے نہ ساہوکاری میں اور پھر میرا تو سلیا سے جتنا کام نکلتا ہے اتنا بامہن کی کنیا سے کیا ہو گا۔ وہ تو بہو بن بیٹھی رہے گی۔ بہت ہوگا تو روٹی بنا دے گی۔ یہاں سلیا اکیلی تین مردوں کا کام کرتی ہے، اور میں اسے روٹی کے سوا اور کیا دیتا ہوں۔ بہت ہوا تو سال میں ایک دھوتی دے دی" (ص ۲۰۶)

یہاں داتا دین کا مادہ پرستانہ اندازِ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ مذہب کا سطحی تصور رکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ فائدہ کہاں ہے۔ اس کے نزدیک انسانیت کی قدر نہیں وہ سمجھتا ہے کہ جس چیز میں فائدہ ہو وہی ٹھیک ہے۔ مذہب اس کے لیے ایک پیشہ اور روزی کا ذریعہ ہے ورنہ اسکے دل میں مذہب کا احترام نہیں۔

نوکھے رام :-

گیئو دان میں نوکھے رام کا مختصر مگر جامع کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں سوسائیٹی کے اس طبقہ کی ترجمانی کی گئی ہے، جو صاحب اقتدار کا نمائندہ بن کر عوام کو پریشان کرتا ہے اور ان کا خون چوستا ہے۔ نوکھے رام رائے صاحب کے کارکن ہیں، وہ بارہ روپے ماہوار پر ملازم ہیں مگر ان کی بالائی آمدنی یا رشوت ستانی کے ذریعہ پیدا کردہ آمدنی ایک ہزار سے کم نہیں۔ وہ اپنے سات بھائیوں کے خاندانوں کی پرورش کا بار اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کا لڑکا انگریزی پڑھتا ہے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں سے شکار پھنسے اور ان کو اپنا حصہ بٹانے کا موقع مل جائے۔ وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ کاشتکار سے لگان وصول کر لیا مگر رسید نہیں دی۔ بعد میں اس کو پریشان کرتے ہیں اور دوبارہ لگان کا مطالبہ کرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے ہوری کے ساتھ کیا۔

اصطلاح میں یہ زمینداروں کے منتظم کار ضلع دار کہلاتے تھے جو ان کے یہاں منتظم ہونے کے علاوہ لگان کی وصولی بھی کرتے تھے یہ طبقہ نہایت بدکردار، راشی، بددیانت اور استحصال پسند ہوتا تھا۔ چونکہ ان کا تعلق براہ راست عوام سے تھا اور لگان مالی معاملہ تھا جس کے وصول کرنے میں سختی کی ضرورت پیش آتی تھی لہذا ان کو با اختیار بنایا جاتا تھا جن کے ساتھ سپاہی بھی رہتے تھے تاکہ رقم آسانی سے وصول ہو سکے۔ گاؤں میں ان کی طوطی بولتی تھی۔ سیاہ و سفید کا انھیں پورا حق تھا۔

اور وہ طرح طرح کی مکاریوں سے غریب کسانوں کو ستا کر روپیہ پیدا کیا کرتے تھے۔

یہ زمیندار اور کسان کے درمیان کا طبقہ نہایت خطرناک تھا جو ایک طرف زمیندار کو خوش کرنے اور دوسری طرف اپنی جیب گرم کرنے کیلئے نہایت ظالمانہ طریقے اختیار کرتا تھا اور کسانوں کو لوٹتا تھا۔ بلکہ لمبا اور قانت ضلع دار اور لگان وصول کرنے والے باہمت کسانوں کے علاقوں میں مارتک ڈالے جاتے تھے۔

نوکھے رام ناول میں زیادہ نمایاں تو نہیں مگر ان کا دل نہایت گندا ہے۔ وہ دو بیویاں پہلے سے رکھے ہیں اور وہ ان کو پردے میں رکھتے ہیں۔ سب سے بری حرکت انھوں نے یہ کی کہ بھولا اہیر کی عورت نہری پر قبضہ کر لیا۔ بھولا اور نیرو کو اپنے گھر میں رکھا اور چونکہ بھولا بوڑھا تھا عورت جوان تھی۔ اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر نوکھے رام نے عملاً بھولا کی زندگی تلخ کر دی۔ یہ صحیح ہے کہ سوسائٹی میں ایسے جنسی واقعات پیش آتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں بہت سے "نوکھے رام" مل سکتے ہیں۔ نوکھے رام کے کردار میں حقیقت کی جلوہ گری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ان تمام حرکتوں کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے برہمن تھے علی الصبح پوجا کرنے بیٹھ جاتے اور ۱۰ بجے دن تک رام نام جپا کرتے مگر "بھگوان کے سامنے سے اٹھتے ہی ان کی فطرت اس رکاوٹ سے بگڑ کر ان کے دل ترا اور عمل سبھی کو زہر آلود بنا دیتی تھی" (ص ۲۰۸)

پریم چند نے ان الفاظ میں کردار کا راز فاش کر دیا اور صاف

بتایا کہ مذہبیت نوکھے رام کی اتنی کمزور ہے کہ وہ معاملات میں ذرا بھی خوف خدا محسوس نہیں کرتے وہ عوام کو لوٹتے ہیں اور اپنے اثر سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں رشوت لیتے ہیں۔

گاؤں کی تمام خوش گپیوں کا مرکز نوکھے رام کی چوپال تھی وہیں بھنگ چھنتی تھی ناچ ہوتا تھا اور ان تفریحات پر وہ دس پانچ خرچ بھی کر دیتے تھے۔ اور کس میں یہ سکت تھی کہ اپنے دروازے پر جلسہ کراتا" (ص ۴۵)

چونکہ نوکھے رام با اثر تھے ایسے لوگ تماشے کے بھی شائق ہوتے ہیں اور پسند کرتے ہیں کہ ان کے دروازہ پر مجمع رہے اور ان کا نام ہو۔

نوکھے رام نے ہوری سے لگان وصول کر لیا مگر دوبارہ پھر طلب کیا اور پہلے کی رسید نہیں دی۔ اس پر گوبر نے عدالت کی دھمکی دی تو پھر ذرا سنبھلے اور بولے کہ خیر اگر تم دے چکے ہو تو لکھا ہو گا۔

جاہل کسانوں کے ساتھ ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں، وہ نہ رسید لینے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو پاتے کہ انہوں نے رقم ادا کر دی ہے۔ جہالت کے باعث ان کی مشکلات دو چند ہو جاتی ہیں۔

جھنگری سنگھ :-

یہ ۵۰ سے اوپر ہیں مگر دو جوان بیویاں رکھتے ہیں۔ عمر کی زیادتی کے باعث دونوں ان سے غیر مطمئن رہتی ہیں اور گاؤں کے نوجوان لڑکوں سے دل بہلاتی ہیں۔ جھنگری سنگھ عورتوں کو شدت سے پردہ کراتے ہیں مگر در پردہ کیا کیا ہوتا ہے۔ اس کی انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

جھنگری سنگھ ساہوکار ہیں سود پر روپیہ دیتے ہیں کسانوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ وہ ہمیشہ مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب پولیس ہیرا کے گھر کی تلاشی لینا چاہتی ہے تو جھنگری سنگھ ہوری کو بلا کر کان میں کہتے ہیں "نکالو جو کچھ دینا ہو یوں گلا نہ چھوٹے گا"۔

جھنگری سنگھ نے لیڈروں سے مشورہ میں ۱۰۰ روپیے تھانیدار کو دینے کی تجویز کی جس میں زیادہ سے زیادہ یہ حضرات خود باہم تقسیم کرلیں اس ان کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور عدم انسانیت کا تصور کیا جا سکتا ہے جھنگری سنگھ نے تیس روپے ہوری کو فوراً قرض دیدئے تاکہ وہ رشوت دے سکے اور پوری عمر ادائیگی سود کے جال میں پھنس سکے۔ رو دے کر احسان رکھا اور کہا "آج ہی کاغذ لکھ دینا تمہارا منہ دیکھ کر رو دے رہا ہوں، تمہاری بھلمنسی پر" (ص ۱۸۶)

یہ ان کی چال تھی ویسے سخت ضرورت پر ادھار نہ دیتے مگر حصہ بانٹ لینے کیلئے فوراً ۳۰ روپیے دے دیئے بہر حال اس پلان کو دھنیا نے خاک میں ملا دیا۔

جھنگری سنگھ کے خیالات پکے خون چوس مہاجن کے ہیں جو مختلف ترکیبوں سے غریبوں کا خون چوستا ہے اور بے رحمی و سخت دلی سے معاملات کرتا ہے۔

داتا دین نے جھنگری سنگھ سے کہا کہ سرکار مہاجنوں سے بیاج کی شرح کم کرنے کو کہہ رہی ہے ورنہ عدالت ان کے حق میں ڈگری نہ دے گی۔ اس پر جھنگری سنگھ تمباکو پھانک کر بولے "پنڈت میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ تمہیں گرج ہو گی تو سو بار ہم سے روپئیے ادھار لینے آؤ گے اور ہم جو بیاج چاہیں گے لیں گے۔ ہمیں اس کانون سے کچھ نہ ہو گا ہم در کم لکھا دیں گے مگر سیکڑے میں پچیس پہلے ہی کاٹ لیں گے۔ اس میں سرکار کیا کر سکتی ہے" (ص ۲۰۴)

پنڈت داتا دین بولے کہ اگر تم اس میں پھنس گئے تو چودہ برس کی سزا ہو گی۔ اس پر جھنگری سنگھ زور سے ہنسے اور بولے تم کیا کہتے ہو پنڈت؟ کیا تب سنسار بدل جائے گا؟ کانون اور نیاو اس کا ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ کانون تو ہے کہ مہاجن کی اسامی سے لڑائی نہ کرے، کوئی جمیندار کسی کاستکار کے ساتھ لڑائی نہ کرے پر کیا ہوتا ہے، یہ تو نت ہی دیکھتے ہو۔ جمیندار مسکین بندھا کر پٹوا تا ہے اور مہاجن لات جوتے سے بات کرتا ہے۔ ہاں جو کسان ہے اس سے نہ جمیندار بولتا ہے اور نہ مہاجن، ایسے کسانوں سے مل جاتے ہیں اور ان کی مدد سے دوسروں کی گردن دباتے ہیں" (ص ۲۰۳)

ان اقتباسات سے جھنگری سنگھ کی شخصیت پوری طرح

سامنے آجاتی ہے۔ وہ پیسے کے پجاری ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بڑے اور صاحبِ اثر کسانوں کو قابو میں کرکے چھوٹے اور غریب کسانوں کو دبایا جا سکتا ہے وہ تمام ترکیبیں جانتے ہیں کہ جن سے کسان پوری عمر ان کا غلام رہے بلکہ اس کی نسلیں بھی سود در سود کے بوجھ سے آزاد نہ ہو سکیں اور وہ اس کے علاوہ بیگار بھی لیتے ہیں۔

کھلیان میں اناج آتے ہی جھنگری سنگھ آکر بیٹھ جاتے اور اپنی "سوائی" وصول کرتے چاہے کسانوں کے یہاں فصل اچھی ہو یا نہ ہو مگر جھنگری سنگھ اپنی "سوائی" لئے بغیر نہ چھوڑتے۔ یہ بے رحمی مہاجنوں کی سرشت ہے جب شکر مل والے کھڑی ایکھ خریدنے لگے اور کسان بیچنے کیلئے لے جانے لگے تو جھنگری سنگھ فوراً پہونچ جاتے۔ اپنا بقایا مع سود کے کسانوں کی ایکھ کی رقم سے کاٹ لیتے اور جو کچھ بچتا دیدیتے۔

آج بھی چھوٹے کسان انھیں مہاجنوں کی نرد میں ہیں ان کے سود کی رقم کبھی ادا نہیں ہو پاتی۔ جھگری سنگھ کوئی بڑے مہاجن نہ تھے۔ بس ۲۵-۳۰ روپیے ماہوار کما لیتے تھے مگر چھوٹے سے گاؤں میں رہ کر بغیر کھیتی کے اتنی رقم بھی پریم چند کے دور میں کمانا کچھ کم نہ تھا۔ پھر ان کی اور بھی آمدنی تھی۔ سوائی ڈیڑھی وصول کرتے تھے رشوت دلانے میں کچھ اپنا حصہ بانٹ کرتے تھے۔ گاؤں کے لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

جھنگری سنگھ گوبر کی آمدنی سے متاثر ہو کر چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو شہر میں اس کے ذریعہ ملازمت دلوا دیں اور اس سے کہتے ہیں کہ "طلب تھوڑی ہو کچھ بات نہیں ہاں چار پیسے کی اوپری آمدنی کی گنجائش ہو" (ص ۲۴۶)

یہ ذہنیت ہے اس سرمایہ دار کی جو عوام کو معاشرہ کو اور حکومت کو مختلف انداز سے اپنے دام میں لینا چاہتا ہے۔ اگرچہ وہ چھوٹا سا ساہوکار ہے مگر اس کے ہتھکنڈے بڑے ہیں ضمیر مفلوج ہے۔ قلب زہر آلود ہے اور فکر پر لالچ کا گہرا چھایا ہے۔ اس کے پاس قصائی کا دل اور بنیئے کا دماغ ہے۔

چونکہ کتاب کا تقریباً نصف حصہ شہری زندگی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسلئے طویل ہونے کے باوجود اس میں بعض دیہاتی مناظر اور عناصر چھوٹ گئے ہیں۔ اس میں کہیں "بازار" کا ذکر نہیں ملتا۔ تمام گاؤں والے سودا سلف کیلئے ہر ہفتہ بازار جاتے ہیں۔ خیر یہ کوئی ضروری امر نہیں کہ ہر شئے کی تفصیل پیش کی جائے یا ہر پہلو کو زبردستی کمویا جائے۔ گئودان کی اصل خوبی وہ جزئیات نگاری ہے جو معاشرتی زندگی کا عکس پیش کرتی ہے یا کسی سماجی کمزوری کی نقاب کشائی کرتی ہے یا کسی نفسیاتی الجھن کی تصویر کشی کرتی ہے یا کسی مادی و معاشی کشمکش کی ترجمانی کرتی ہے یا کسی جنسی پہلو کے پیچیدہ نازک مسئلے کو سامنے لاتی ہے۔ گئودان میں ایسی جزئیات نگاری بہت ہے اور ان چھوٹے چھوٹے ضمنی قصوں میں زندگی اور معاشرے کے بڑے راز اور زندہ حقائق پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے اصل زندگی اور اسکے مسائل کا علم ہوتا ہے۔ جو دیہاتی ماحول میں لوگوں کو پیش آتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کے مسائل بھی دلکش ہیں اسلئے کہ انسان کی زندگی خود ایک دلکش حقیقت ہے جس میں سماجی، نفسیاتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی مسائل پوشیدہ ہیں۔

گئودان میں انسانی نفسیات خصوصاً ہندوستانی دیہاتیوں کی نفسیات پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ اس طرز کے چند واقعات حسب ذیل ہیں:-

جب گوبر نے گاؤں کے سرغنوں کی نقل رات کو دکھائی تو اگرچہ جھنگری سنگھ نوکھے رام، داتا دین اور منگرو ساکو بہت ناگوار ہوا مگر دل ہی دل میں ہر ایک دوسرے کی نقل پر خوش ہوا۔ اس لئے کہ باہم بھی نفاق موجود تھا جب اپنے رقیب کی نقل ہوئی تو نفسیاتی طور پہ خوشی ہوئی مگر اپنی نقل پر دل دکھا نوکھے رام بولے کہ نقل بالکل صحیح تھی۔ جھنگری سنگھ کی چھوٹی ٹھکرائن کو ہم نے اکثر نوجوان لڑکوں سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا ہے۔

سرداروں کے نفسیاتی مکالموں میں بڑی دلکشی کے ساتھ حقائق سامنے آتے ہیں۔ داتا دین اپنی گفتگو میں اور جھنگری سنگھ اپنی بات چیت میں اپنی نفسیات کا اظہار بخوبی کرتے ہیں۔ دل کی چھپی ہوئی کیفیات کا بیان صاف نظر آتا ہے۔ دیہاتی زندگی کا رشک وحسد اور انسانی نفسیات کی گتھیاں مختلف کرداروں کے ذریعہ واضح کی گئی ہیں، خصوصاً ہیرا، ہوری، داتا دین اور جھنگری سنگھ کے یہاں نفسیات کا مطالعہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر مہتا:-

کہا جاتا ہے کہ پروفیسر مہتا پریم چند کا نمونہ کا کردار ہے اس کی شخصیت میں جو اعلیٰ صفات انھوں نے پیش کیئے ہیں وہ ان کو محبوب ہیں۔ مہتا ان کا آدرش کردار ہے جو خود ان کی زندگی کا نمونہ ہے بہ الفاظ دیگر مہتا پریم چند کا کردار ہے۔ مجھے اس تصور کے قبول کرنے میں تذبذب محسوس ہوتا ہے۔ پریم چند اور مہتا کے کردار قطعاً مختلف ہیں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لیئے یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ البتہ میں اس امر کو تسلیم کر سکتا ہوں کہ پریم چند کو جو خیالات اور جو اعلیٰ اخلاقی و نفسانی قدریں محبوب تھیں ان کو انھوں نے پروفیسر مہتا کے کردار کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس شکل میں ان کا محبوب کردار ہو سکتا ہے مگر ان کے کردار کا عکس نہیں بن سکتا اور حق یہ ہے کہ پریم چند سے مہتا کا کردار بالکل الگ ہے۔ پریم چند کار پر نہیں چلتے وہ پروفیسر نہیں فلسفی نہیں وہ غیر شادی شدہ نہیں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔

بہرحال یہ آئیڈیل کردار پریم چند کے ناول کی سطح بلند ضرور کر دیتا ہے۔ گئودان میں وہ حصہ اعلیٰ خیالات کے لحاظ سے بہت بلند ہے جہاں مہتا گوبندی زوجہ کھنا سے گفتگو کرتا ہے۔ گوبندی کے خیالات بھی بلند اور ستھرے ہیں وہ جو خیالات پیش کرتی ہے وہ درحقیقت مہتا کا آدرش ہیں بلکہ اسی ضمن میں مہتا اپنے نظریات کی تشریح بھی کرتا ہے۔ ایک موقع پر مہتا گوبندی سے کہتا ہے کہ شاعر کیلیے "کشش و

مسرت کی چیز توری ہوئی اُمیدیں مٹی ہوئی یادگاریں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے آنسو ہیں۔"

مہتا کے اندر ایک کمزوری تھی وہ شراب پیتا تھا، گوبندی نے ایک بار اس پر طنز کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اس نے توبہ کرلی یہ دراصل مہتا کے اعلیٰ کردار کی عظمت ہے۔

علمی زندگی کے ساتھ ساتھ مہتا کو عوامی اور سماجی مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کا نظریہ مزدوروں کے بارے میں اس وقت سامنے آتا ہے۔ جب مسٹر کھنا جو شکر مل چلاتے ہیں مزدوروں کی تنخواہ کم دیتے ہیں، کسانوں کی ایکھ تولنے کیلئے چھوٹے بانٹ بنوا رکھے ہیں وہ مزدوروں کی شکایت مہتا سے کرتے ہیں تو مہتا اس کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

"آپ کے مزدور بلوں میں رہتے ہیں۔ گندے اور بدبودار بلوں میں جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو قے ہو جائے جو کپڑے وہ پہنتے ہیں۔ ان سے آپ اپنے جوتے بھی نہ صاف کریں گے جو کھانا وہ کھاتے ہیں وہ آپ کا کتا بھی نہ کھائے گا۔ میں نے ان کی زندگی میں حصہ لیا ہے۔ آپ ان کی روٹیاں چھین کر اپنے حصہ داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں۔"

ناول میں مسز گوبندی اور مہتا کے تعلقات مختصر ہیں اس کے مقابلہ میں مس مالتی اور مہتا کے تعلقات زیادہ اور بہت گہرے ہیں۔ ان دونوں کے تعلقات روحانی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر پھر بھی شادی کی نوبت

نہیں آتی اس کی وجہ پہلے مہتا کی بے نیازی ہے اور بعد میں مس مالتی کی بے نیازی جس کے باعث شادی نہیں ہوتی۔ مس مالتی پر مہتا کے حسن کردار کا نقش ایسا قائم ہو گیا کہ اس کی زندگی بالکل بدل گئی اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ زندگی میں وہ صرف خدمت خلق کرے گی۔

مہتا نہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور نہ مذہب پر بلکہ ان کو انسانیت خدمت اور محنت پر یقین ہے اور وہ اسی کی تلقین اپنی مختلف گفتگوؤں میں کرتے ہیں۔ ان کے کردار میں استقلال، اخلاق اور وسعت مطالعہ کی طاقت اور اثر ہے۔ مہتا کہتے ہیں۔

"میں قدرت کا پجاری ہوں اور انسان کو اس کی قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں جو خوش ہو کر ہنستا ہے۔ غمگین ہو کر روتا ہے اور غصہ میں آ کر مار ڈالتا ہے جو دکھ اور سکھ دونوں کو دباتے ہیں جو رونے کو کمزوری اور ہنسنے کو سبکی سمجھتے ہیں ان سے میرا کوئی لگاؤ نہیں۔ زندگی میرے لئے خوشی بھر ا کھیل ہے سادہ اور کھلا ہوا جہاں برائی حسد اور جلن کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ میں ماضی کی فکر نہیں کرتا اور نہ مستقبل کی پرواہ کرتا ہوں۔ میرے لئے حال ہی میں سب کچھ ہے مستقبل کی فکر ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ ماضی کا بوجھ ہماری کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم میں زندگی کی طاقت اتنی کم ہے کہ ماضی اور مستقبل میں پھیلا دینے سے اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم مفت کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر رواجوں عقیدوں اور تاریخوں کے ملبے کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ طاقت ہی نہیں رہی جو طاقت عقل انسانی فرائض کئے پورا کرنے میں لگنی چاہیے تھی باہمی امداد میں اور بھائی چارہ میں وہ

پرانی عداوتوں کا بدلہ لینے اور آبا و اجداد کا قرضہ ادا کرنے میں تمام ہو جاتی ہے (ص ۳۱۴)

اِس عبارت میں مہتا کے اعلیٰ خیالات وضاحت سے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ مہتا ایک اعلیٰ کردار و نظریات کے آدمی ہیں جنکا مذہب انسانیت پرستی ہے۔ درحقیقت مہتا احترام انسانیت کا قائل ہے۔

آدمیت احترام آدمی ؎ باخبر شو از مقام آدمی

پروہ کاربند نظر آتے ہیں۔

مہتا، مالتی اور گوبندی تینوں اعلیٰ خیالات کا اظہار کرتے ہیں یہ دونوں کردار پروفیسر مہتا سے متصل و متعلق ہیں۔ مس مالتی اور مہتا میں غیر معمولی ربط وضبط نظر آتا ہے۔ مالتی پہلے عام تعلیم یافتہ عورتوں کے انداز سے ظاہر ہوتی ہے مگر مہتا کے اعلیٰ خیالات اس کی زندگی کا رنگ بدل دیتے ہیں وہ اگرچہ کوٹھی میں رہتی ہے کار پر چلتی ہے، مگر اس نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنا لیا ہے کہ وہ غریبوں اور مجبوروں کی خدمت اپنی ڈاکٹری سے کرے گی اور شادی نہ کرے گی۔ اس کا عشق مہتا سے اور مہتا کی محبت اس سے اتنی زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ ابتدا میں ہر شخص قیاس کر سکتا ہے کہ دونوں شادی کر لیں گے مگر انسان کے خیال کی رو بدلتی رہتی ہے۔ اس تبدیلیٔ تخیل کے باعث دونوں شادی کے بندھن میں یکجا نہ ہوسکے۔

مس مالتی کے کردار میں دورِ جدید کی جنسی بے راہ روی کا عکس کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ کئی اشخاص سے بہت بے تکلفی سے ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن گوبندی مہتا کے سامنے روتی ہے اور

اس سے کہتی ہے کہ میرے شوہر (دکھنہ) کو مس مالتی چھینے لے رہی ہے۔ مہتا سمجھاتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں۔ اسی طرح جب مہتا خان بن کر جلسہ میں آتا ہے اور ایک ہزار روپیہ کا مطالبہ کرتا ہے تو مس مالتی اس کو خان سمجھ کر اس کی جوانی پر ریجھ جاتی ہے۔ اور اس پر للچائی ہوئی نظر ڈالتی ہے' اس کا ایک منظر ملاحظہ فرمایئے:۔

خان: ام اب نہیں مانے گا ام اتنی دیر سے یہاں کھڑا ہے تم لوگ کوئی جواب نہیں دیتا (جیب سے سیٹی نکال کر) ام تم کو ایک لمحہ اور دیتا ہے۔ اگر تم روپیے نہیں دیتا تو ہم سیٹی بجائے گا اور امارا پچیس ۲۵ جوان یہاں آجائے گا" پھر آنکھوں سے اظہار عشق کرتے ہوئے مس مالتی سے بولا" تم امارے ساتھ چلے گا۔ دلدار! ام تمارے اوپر فدا ہو جائے گا اپنا جان تمارے قدموں پر رکھ دے گا"۔ "مگر مس مالتی کے دلی خیالات کچھ اور ہی تھے خان کی محبت بھری نگاہوں نے انھیں مطمئن کر دیا تھا اور اب اس تماشے میں انھیں کچھ منچلے پن کا سرور آرہا تھا۔ ان کا جی کچھ جوان مردوں کے بیچ میں رہ کر ان کے وحشیانہ عشق کا لطف اٹھانے کیلئے للچا رہا تھا۔ مہذبانہ عشق کی کمزوری اور مردہ دلی کا انھیں تجربہ ہو چکا تھا۔ آج وحشی و نامہذب پٹھانوں کے مجنونانہ عشق کیلئے ان کا دل بےقرار تھا" (ص ۱۱۵)

اس سے ایک طرف مہتا کی ظرافت اور دوسری طرف شہری کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

مس مالتی اور پروفیسر مہتا میں علمی و سماجی تعلقات ضرور ہیں مگر مہتا کو جتنا حقیقی تعلق مسز کھنہ سے نظر آتا ہے اتنا مالتی سے نہیں یہ

مہتا گوبندی کو اس لائق سمجھتا ہے کہ وہ اس کی بیوی بن سکے یعنی اس کے اندر جو صفات ہیں وہ اس کا معیار ہیں اس کے برعکس وہ اپنی پسندیدہ صفات مس مالتی میں نہیں پاتا۔

مہتا نے مایوسی سے کہا "ایسی عورت تو کہیں ملتی ہی نہیں"؛ کیوں؛ مس مالتی نہیں ہیں؛ خوبصورت تعلیم یافتہ، ہنرمند، دلفریب اور آپ کیا چاہتے ہیں؟"

مس مالتی میں وہ ایک بات بھی نہیں ہے جو میں اپنی اہلیہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

ان میں کیا برائی ہے سنوں تو۔ بھونرے ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آجکل مردوں کو ایسی ہی عورتیں پسند آتی ہیں۔

مہتا گوبندی ہی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ ایسی پسندیدہ صفات عورت تو اسی شہر میں موجود ہے" ایک لکھ پتی کی بیوی ہے مگر عیش و عشرت کو ہیچ سمجھتی ہے جو بے رخی اور بے عزتی سہہ کر بھی اپنے فرائض سے منحرف نہیں ہوتی جو مادریت کی قربان گاہ پر خود کو چڑھا دیتی ہے۔ جس کیلئے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے اور جو اس قابل ہے کہ اسکی مورت بنا کر پوجی جائے"

مہتا اپنی آنکھوں سے گوبندی کی بے عزتی اور مسٹر کھنا کی اس سے لاپروائی دیکھتے ہیں۔ مگر مردوں کے عورتوں پر مظالم کی برائی نہیں کرتے بلکہ عورتوں کے بارے میں ان کا نظریہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں معلوم ہوتا۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ "میں سمجھتا ہوں کہ عورت صرف ماں ہے اور اس کے علاوہ وہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کا محض ابتدائی ظہور ہے۔ ماں ہونا دنیا کی سب سے بڑی ریاضت سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی فتح ہے" (ص ۳۲۶)

وہ عورتوں پر مظالم روکنے کی گفتگو کے بجائے فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں۔

مسٹر مہتا آزاد خیال اور آزاد آدمی ہیں، وہ روایت پرستی سے بھاگتے ہیں، وہ مکتی کے تصوّر کا مذاق اڑاتے ہیں اور رسم و رواج کے قائل نہیں۔ وہ خدا کا تصور بھی عام لوگوں سے الگ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں آدمی کی عزت اور حسنِ اخلاق ہی مذہب ہے۔ وہ صاف اعلان کرتے ہیں۔

"جو یہ ایشور اور مکتی کا چکر ہے۔ اس پر تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ یہ مکتی اور بھگتی تو انتہائی خودی ہے۔ یہ ہماری انسانیت کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ جہاں زندگی ہے کھیل ہے، چہک ہے۔ پریم ہے وہیں ایشور ہے اور زندگی کو سکھی بنانا ہی عبادت ہے اور نجات ہے۔ گیان والا کہتا ہے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئے آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ میں کہتا ہوں اگر تم ہنس نہیں سکتے تو تم انسان نہیں ہو، پتھر ہو۔ وہ گیان جو انسانیت کو پیس ڈالے گیان نہیں ہے کولہو ہے" (ص ۳۲۵)

ایک دوسرے مقام پر بھی وہ اپنے کو دہریہ کہتے ہیں۔ ان کی آزاد خیالی میں مذہب کے خلاف کچھ بھی نہیں۔ وہ صرف ان مذہبی عناصر کے خلاف ہیں جو زندگی کو غم دیتے اور ناخوشگوار بناتے ہیں۔ وہ اس عبادت اور اس خدا کو پسند کرتے ہیں جس سے زندگی خوشگوار ہو سکے۔

وہ فلسفی ہیں سائنسداں ہیں۔ حقیقت پسند ہیں آزاد خیال ہیں اور توہمات سے نالاں ہیں۔ ان تمام صفات کے باوجود ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھلنڈرے ہیں اور عاشق مزاج بھی جس سنجیدگی اور اعلیٰ کردار کی ترجمانی مہتا کے ذریعہ کی گئی ہے۔ دراصل کہیں کہیں وہ نبھ نہیں پائی ہے۔ مس مالتی سے ان کے تعلقات کبھی کبھی غیر سنجیدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ آخر میں دونوں ایک نہایت اعلیٰ مقصد پر گامزن نظر آتے ہیں۔ یہ خان والے قصہ میں بھی مہتا غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں۔

مہتا سروج کی شادی رائے صاحب کے بیٹے سے ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور رائے صاحب سے کہتے ہیں کہ آپ کی شادی کی ذمہ داری آپ پر ہے مگر آپ نے بیٹے کی شادی کی ذمہ داری خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں عائد کر لی ہے۔

مہتا حسنِ اخلاق کے حامل ہیں۔ انسانیت پرست ہیں۔ مگر ان کی انسانیت پرستی اور حسن اخلاق کا منبع ذاتِ باری نہیں ہے۔ وہ آدمی کی خدمت کو ایک قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اخلاق کا تعلق مذہب سے قائم نہیں کرتے بلکہ ہندو مذہب کا ذکر دو ایک جگہ منفی انداز سے کرتے ہیں۔

یہ اخلاق قابلِ غور ہے جس کو قائم و دائم رکھنے کیلئے طاقت یا مرکز نہیں ہوتا۔ مہتا کا کردار باوجود بلند ہونے کے لاپروائی سے تجرد اور تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض عیوب بھی رکھتا ہے۔ اس میں مبالغہ ہے۔ فلسفہ اور علم نباتات دونوں کا ماہر اس کو قرار دیا گیا ہے۔

مِسں مالتی

مِس مالتی گئودان کے اہم کرداروں میں سے ہے۔ وہ نہایت ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ اور سوشیل زندگی میں حصہ لینے والی عورت ہے۔ وہ بے تکلف مردوں کی محفل میں شریک ہوتی ہے اس کے دوست سب مرد ہیں، مسٹر کھنا مسٹر مہتا اور دوسرے شہری کردار۔ شروع میں وہ صرف ایک عام عورت کی طرح دکھائی گئی ہے جو خوبصورت ہے۔ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ مطب کرتی ہے۔ دوستوں کے مجمع کی زینت ہے۔ پروفیسر مہتا اس سے قریب تر ہیں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مہتا اعلیٰ مقاصدِ حیات کے حامل ہیں۔ ان کی زندگی محسن اخلاق اور آدرشوں سے مالتی متاثر ہوتی ہے وہ طے کر لیتی ہے کہ وہ ہمیشہ عوام کی خدمت کرے گی اس کو ڈاکٹری کا فن آتا تھا وہ ایک اچھی معالج تھی اس لیئے اس پیشہ سے اس نے غرباء کی خدمت کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ جب پروفیسر مہتا اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ صاف انکار کرتی ہے اور اپنا عزم ظاہر کرتی ہے کہ وہ عمر عزیز عوام کی بھلائی میں گذارے گی۔ وہ سوشیل کاموں میں بھی حصہ لیتی ہے وہ شہر کانگرس کی صدر بھی ہے۔ اس کا مقام اور عظمت کسی مرد کردار سے کم نہیں۔ اس کی خاکساری کی حد یہ ہے کہ وہ گوبر جیسے مزدور کے لڑکے کا علاج کرتی ہے۔ اس کو اپنی گود میں کھلاتی ہے اور کسی قسم کا ذات پات طبقاتی فرق محسوس نہیں کرتی۔

پریم چند نے مالتی کا کردار بہت طویل انداز سے پیش کیا۔ مہتا اور مالتی کے مکالمے اکتا دینے والے ہیں۔ ان میں اختصار کی ضرورت تھی بہر حال ان مکالموں کے ذریعہ اس کے کردار کا ایک ایک نقش واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

مہتا اور مالتی کے کردار معیاری تو ہیں مگر عملی نہیں، دونوں عملی زندگی اور تاہلی مسائل میں داخل نہیں ہوتے دونوں زندگی کے اصل مسائل بال بچوں کی پرورش اور گھریلو جھگڑوں سے الگ تھلگ ایک اپنی دنیا بساتے ہیں جو روحانی فضا میں گویا ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہیں یہ مثالی کردار ہیں ان کی مثالیت یہاں تک پہونچتی ہے کہ یہ دنیاوی علائق میں الجھنا نہیں چاہتے۔ مالتی آخر میں تو بالکل ایک مذہبی دیوی کی طرح مقدس شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کی حالت پہلے کے مقابلہ میں بدل جاتی ہے۔ وہ عاشقانہ کیفیت بھی نظر نہیں آتی۔ جس کا ذکر پہلے ملتا ہے۔

مالتی اکثر جگہ ایک زینت محفل کے انداز میں دکھائی گئی ہے۔ اس لوگ ہنسی مذاق کرتے ہیں اس کو بعض آوارہ تصور کرتے ہیں۔ وہ مرد بہت بے تکلف ہے۔ اس کے یہاں وہ ماحول ملتا ہے۔ جو نہایت ترقی یافتہ مغرب زدہ خواتین کا انداز ہے۔ مگر بعد میں مہتا اس کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔

مس مالتی کا برتاؤ مردوں کے ساتھ کچھ ایسا ہے جیسے اس پر کوئی لٹو ہو گئے آدمی جان دیتے ہیں۔ وہ کھنہ سے اس قدر گھل مل کر رہتی

گوبندی اِس کو اپنا رقیب سمجھ لیتی ہے۔ وہ مسٹر مہتا کے ساتھ اتنے تعلقات بڑھاتی ہے کہ مرزا خورشید اور دوسرے لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ ان سے شادی کرے گی۔ بعد میں اس کا کردار اس قدر عمدہ ہو جاتا ہے اس کے خیالات اتنے پاکیزہ اور بلند ہو جاتے ہیں اور اس کی زندگی اتنی معیاری ہو جاتی ہے کہ مہتا جیسا قابل اِنسان اس کو پوجنے کے لایق تصور کرتا ہے۔

مس مالتی کا یہ بنیادی تصور ہے کہ عورتوں کو آزادی ملنی چاہیئے۔ انھیں معاشی معاملات میں مردوں پر انحصار نہ کرنا چاہیئے۔ اِن کے حقوق کو صدیوں سے دبا دیا گیا ہے۔ اگرچہ مسٹر مہتا باوجود تمام علم و دانش کے عورتوں کے گھریلو پن اور گھر گرہست ہونے کو اولیت دیتے ہیں مگر مالتی عورتوں کے حقوق کی نمائندگی بڑی وضاحت اور زور بیان سے کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں میں تفریق برتنا مردوں کا ظلم ہے۔

مِس مالتی پروفیسر مہتا پر جان دیتی ہے وہ اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مہتا اعلیٰ خیالات اور بلند اخلاق کا مجسمہ ہیں وہ حسین جسیم بھی ہیں۔ انکے اندر اسے کوشش بھی محسوس ہوتی ہے۔

مِس مالتی کی زندگی ایک تعلیم یافتہ اور عوامی زندگی کو بہتر بنانے والی سوشیل ورکر کی ہے۔ اس کا مقصد حیات دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ اس کو مادی خوشیاں بے قیمت

محسوس ہوتی تھیں وہ گاؤں میں جا کر عورتوں کو صفائی کا درس دیتی تھی۔ وہ دوسروں کا مفت علاج کرکے غریبوں کی تکلیفوں کو دور کرکے مسرت محسوس کرتی تھی۔ مالتی نسائیت کے اس بلند معیار پر پہونچ گئی تھی جہاں وہ نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں، عقیدت کی چیز تھی"۔ (ص ۵۵۸)۔

وہ مہتا سے صاف کہتی ہے کہ اس نے اب طے کر لیا ہے کہ زن و شوہر بن کر رہنے کے بجائے ہم دونوں دوست بنکر رہیں گے۔ اس سے یہ نفع والبستہ ہے کہ ہماری صلاحیتیں بچوں کو پالنے میں لگنے کے بجائے انسانیت کی خدمت میں صرف ہوں گی تم جیسے طباع اور دانش مند کی روح کو میں اس قید میں بند نہیں کرنا چاہتی" (ص ۵۶۱)

وہ کہتی ہے کہ تجرد کی زندگی میں خلوص اور بے لوثی ہوتی ہے۔ اس میں سوشل کام کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں مگر شادی شدہ زندگی میں صلاحیتیں نئی ذمہ داریوں کے پورا کرنے پر صرف ہوجاتی ہیں۔ یہ پریم چند کا وہ تخیل ہے۔ جس کو برہماچاری کہا جاتا ہے۔ ہندو سادھو شادی نہیں کرتے۔

"مالتی مہتا سے کہتی ہے کہ" دنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے"۔ (ص ۵۶۱)

مہتا اور مالتی دونوں کے کردار پر ہندو فلسفے کے اثرات نمایاں ہیں۔

رائے اگر پال سنگھ:

رائے صاحب بڑے منتظم، دور اندیش، مصلحت پسند اور شہرت کے دلدادہ زمیندار ہیں۔ وہ قرض لیکر اپنی خاندانی آن بان قائم رکھتے ہیں۔ وہ رہتے تو دیہات میں ہیں مگر ان کی کوٹھیاں لکھنؤ، نینی تال، مسوری اور شملے میں ہیں۔ وہ دوسرے راجاؤں خصوصاً راجہ پرتاب سنگھ سے مقابلہ کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہے۔ اس حلقہ میں مسٹر کھنا، مسٹر مہتا، مسٹر تنخا، مرزا خورشید اونکار ناتھ اور مس مالتی ممتاز شخصیتیں ہیں۔

رائے صاحب زمانہ شناس ہیں، کانگریس میں رہ کر جیل کی ہوا کھا چکے ہیں مگر اس سے خوش نہیں ہیں، خوشی ان کو انگریزوں سے مل کر اور حکومت کے اعزاز حاصل کرنے سے ہوتی ہے۔ ان کی تین بڑی خواہشیں تھیں اتفاق دیکھئے کہ وہ تینوں پوری ہو گئیں۔ لڑکی کی شادی دھوم دھام سے کی۔ مقدمہ میں کامیابی حاصل کی اور الکشن میں نہ صرف منتخب ہو گئے بلکہ ہوم ممبر بھی بنا دیئے گئے اور پھر حکومت نے ان کو راجا کا خطاب بھی عطا کر دیا اس طرح عظمت کے سارے پہلوان کے اندر جمع ہو گئے۔ ان سب باتوں سے زیادہ خوشی انھیں اس کی ہوئی کہ ان کے قدیم رقیب راجہ پرتاب سنگھ نے ان کے بیٹے رو پال سنگھ سے اپنی بیٹی کی شادی کا پیغام دیا۔ ان کے اندر وہ تمام حربے موجود ہیں جو ایک راجہ میں ہوتے ہیں۔

اگرچہ رائے صاحب طبیعتاً شریف ہیں ظلم پسند نہیں کرتے مگر روایت پرستی، فخر اور شان دکھانے کی عادت سے مجبور ہیں ایک بار وہ ہوری سے شکایت کرتے ہیں کہ لوگ مجھے سکھی تصور کرتے ہیں مگر میں تو ہزاروں بلاؤں اور مشکلوں میں گرفتار ہوں مقدمے، قرض انگریزوں کی دعوتیں اور افسروں کے تحفے اپنی حیثیت کو قائم رکھنا اور ان سب کیلئے کسانوں سے روپیہ وصول کرنا یہ سارے مسائل پریشان کن ہیں، مگر اپنی پریشانی کس سے کہوں ؛

رائے صاحب کی پریشانیاں اس وقت اور بڑھ جاتی ہیں، جب ساری ان کی کامیابیاں ناکامیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جب ان کا لڑکا رو پال سنگھ راجہ پرتاب کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور مس مالتی کی بہن سروج سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف ان کی لڑکی میناکشی نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مسٹر دِگ بجے سنگھ کو ہنٹر سے مارا بھی۔ ان حالات نے ان کی سیاسی فتوحات اور خوشیوں کو غم میں تبدیل کر دیا۔ اس پریشانی میں وہ مہتا کے پاس گئے کہ وہ مس مالتی سے کہہ کر سروج پر اثر ڈال کر ان کے لڑکے سے اس کی شادی نہ ہونے دیں مسٹر مہتا روشن خیال آدمی ہیں۔ انھوں نے تمام باتیں سن کر بڑا دلچسپ جواب دیا کہ "آپ اپنی شادی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں لڑکے کی شادی کی ذمہ داری آپ کیوں اپنے اوپر لیتے ہیں" (ص ۵۲۵)

"رائے صاحب کسانوں سے بیگار بھی لیتے ہیں۔ انھوں نے

ہوری کا وہ جرمانہ جو گاؤں والوں نے اس پر عاید کیا تھا خود لے لیا۔ بہرحال وہ سرمایہ دار ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ جو اخراجات ان پر پڑتے ہیں وہ کسانوں ہی سے وصول کئے جاتے ہیں۔ اونچے طبقہ کی مشکلات، تفریحات، پیچیدگیاں، عیاریاں اور مصلحت پسندیاں رائے صاحب کی شخصیت میں مجسم ہو گئی ہیں پھر بھی وہ ذرا ماڈرن طرز کے زمیندار ہیں، کانگریسی ہیں دل سے ظلم کو پسند نہیں کرتے مگر مجبور ہیں۔

وہ جن حالات میں گھرے ہیں ان سے نکلنے کی نہ ان میں ہمت ہے اور نہ ان کے نظریے اتنے طاقتور ہیں کہ وہ ایمانداری سے سارے کام چلائیں ان کی مشکل اصل یہ ہے کہ " ان کی روح کے اونچے سنسکاروں کی بربادی نہ ہوئی تھی ظلم، مکاری، بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی (ص ۲۵۲)

یہاں پریم چند کچھ ایسے مسائل سامنے لاتے ہیں جن سے اکثر انسانوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک پیشہ میں گرفتار ہے حالانکہ ضمیر اس سے راضی نہیں۔ انسان ایک چیز مصلحت، یا کسی جبری و خاندانی روایت کے پیش نظر کرتا ہے۔ مگر دل اس سے خوش نہیں ہوتا۔ رائے صاحب زمینداری کے مظالم سے خوش نہیں مگر کرتے ضرور ہیں۔

شادی کے مسائل جن سے رائے صاحب کو نپٹنا پڑا وہ بھی ہمارے معاشرہ کے عام مسائل ہیں۔ کتنے ہی والدین لڑکے کی شادی

زبردستی کرتے ہیں اور اپنی پسند اس پر تھوپ دیتے ہیں اسی طرح کتنی عورتیں ہیں جو غلط کار شوہروں سے نالاں ہیں روپال سنگھ اور میناکشی دونوں کا کردار معاشرہ کی نہایت عمدہ تصویر ہے جس میں رائے صاحب کے فرسودہ اور زمیندارانہ خیالات مسائل کو پیچیدہ کر دیتے ہیں، وہ بیٹے کی خوشی نہیں بلکہ دولت اور زمیندارانہ اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

ان کی بیٹی حقوقِ نسواں کی علمبردار ہے جو پہلے راہرو شوہر سے عاجز ہے اور بالآخر اس سے پیچھا چھڑاتی ہے اور اس کو زدوکوب کر کے اس سے علیحدگی اختیار کرتی ہے۔

مختلف حیثیتوں سے جو کردار رائے صاحب کا ہے وہ باوجود ایک روشن خیال زمیندار ہونے کے سرمایہ دارانہ خو بو رکھتا ہے۔ فرسودہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کا حامل ہے۔

رائے صاحب کی زندگی کے بہت سے مسائل آج بھی معاشرہ میں نظر آتے ہیں۔ مالداروں میں باہمی رقابت، دوستوں کی صحبتیں اور گھریلو مشکلات آج بھی باقی ہیں زمینداری کا خاتمہ انسانی کردار کے اندر مسائل کا انبار ختم نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے سرمایہ دار کمپنیوں اور انڈسٹری چلانے والے آج رائے صاحب کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور عیاری سے عوام پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

مرزا خورشید

مرزا خورشید بگڑے ہوئے مسلم کردار کا صحیح نمونہ ہیں وہ کھانے اڑانے والے ہیں لاابالی ہیں پیتے پلاتے ہیں یادباش ہیں مزدوروں کے رہنما ہیں ہزاروں کماتے ہیں مگر جب تک اڑا نہ دیں ان کو چین نہیں آتا۔ شہری کرداروں میں ان کا نام کئی جگہ آیا ہے۔ وہ گوبر کو مفت کوٹھری دیدیتے ہیں اور اس کی بے مروتی پر بھی اس سے کمرہ خالی نہیں کراتے۔ وہ نہایت طاقتور اور جسیم ہیں۔ دوستوں کا خیال رکھتے ہیں بے ایمانی نہیں کرتے اور چالاک بھی ہیں چاہیں تو ہزار طریقے سے روپیہ پیدا کرلیں مگر ان کی زندگی ہرچہ بادا باد ہے۔ ان کی زندگی بقول جگر ؎

نہ احساس ہستی نہ ادراک مستی ؎ جدھر چل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں

کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اندر ایک صفت یہ تھی کہ وہ جس پر احسان کرتے ہیں اس سے ایک پیسہ قبول کرنا پسند نہیں کرتے۔ شاہ خرچ ہونے کے علاوہ بات کے پکے ہیں وعدہ پر جیے رہنے والے ہیں "دوست احباب" ان پر اعتبار کرتے ہیں جس کام کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اس کو مکمل کرکے چھوڑتے ہیں۔ وسیع المشرب ہیں۔ مزدوروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اونچے حلقہ میں بھی متعارف ہیں اور عوام میں بھی ان میں بے پناہ طاقت ہے۔ گوشت کھانے کے شوقین ہیں۔ ہرن مارکر اس کو اٹھالاتے ہیں اس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ مسٹر تنخا کے چھکے چھوٹ گئے۔ مگر مرزا خورشید بغیر کسی خاص محنت کے اٹھاکے لیئے چلے آئے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر مسلم دوستوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں۔ ان کی تمام مصروفیات میں یکساں شریک ہوتے ہیں بھید بھاؤ وہ نہیں جانتے۔ من موجی ہیں، جو شوق ہو گیا۔ اس کیلئے سراپا جد وجہد بن گئے۔ وہ گوبر کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ رائے صاحب کے ساتھ تمام دوستانہ صحبتوں میں شریک رہتے ہیں۔

یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرزا خورشید کا کردار پوری طرح اُبھرتا نہیں۔ وہ مزدوروں کے رہنما ہیں مگر کبھی ان کو ان کی محفلوں میں ان کے مسائل اور ان کی طرف سے احتجاجی جلسوں میں نہیں دکھایا گیا۔ کبھی مزدور ان سے ملنے اور ان کے سامنے اپنے معاملے طے کرنے نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ اونچے طبقہ کے تفریحی پروگراموں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جس سے ان کی اصل پوزیشن دب جاتی ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وہ خود متوسط طبقہ سے ہیں جو اونچے طبقہ کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ان کی طرح بننا چاہتا ہے۔ مگر ان کا جو پیشہ بتایا گیا ہے۔ اس کا ناول سے بہت کم پتہ چلتا ہے۔ ایک آدھ بار مزدوروں کے ذکر کے علاوہ باقی وہ ایک عیش پرست بادہ مست اور تفریح باز انسان کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پریم چند نے اس کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ عیش پرست مزدور رہنما بھی گورنمنٹ کے نمائندوں سے ملتا ہے۔ جلسوں کو خطاب کرتا ہے، اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتا ہے اور بیان دیتا ہے۔ مزدوروں کے مسائل سے الجھتا ہے اور دوسروں کو

الجھاتا ہے مگر یہاں ان اُمور کا پتہ تک نہیں چلتا۔

مرزا خورشید کی گذشتہ زندگی پر مسٹر کھنا مل مالک غصہ ہو کر کہتے ہیں "یہ تیاگی مرزا بھی تو ایک دن لکھ پتی تھے اور ہزاروں مزدور ان کے یہاں کام کرتے تھے تو کیا وہ اپنی ضرورت بھر کے لیے لیکر بقیہ رقم مزدوروں کو بانٹ دیتے تھے؟ کیا وہ اسی ضرورت بھر کی قلیل رقم میں یور پین چھوکریوں کے ساتھ عیش کرتے اور بڑے بڑے افسروں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے۔ ہزاروں روپئے ماہوار کی شراب پی جاتے تھے اور ہر سال فرانس یا سوئزرلینڈ کی سیر کرتے تھے؟ آج مزدوروں کی حالت دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹتا ہے"؟

مرزا کی ہمہ جہت شخصیت کی ترجمانی ان کے احاطہ کے بیان میں زیادہ دلکش انداز سے پیش کی گئی ہے۔ ورنہ مذکورہ بالا عبارت سے ان کی تفتیش پرستی ہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرزا پر یہ تنقید بالکل صحیح ہے کہ وہ اونچے متوسط طبقے کے آدمی ہیں۔ جو حالات کے لحاظ سے مجبوری کے باعث مزدوروں کے لیڈر بن گئے ہیں اور اور اب بھی ان کا اندازہ نچلے طبقہ سے بالکل مختلف نہیں بلکہ وہ للچائی ہوئی نظروں سے اونچے طبقہ کو دیکھتے ہیں، مگر مرزا نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ طبیعت میں وسعت وعظمت کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ مزدور وغریب سے حسن سلوک کرتے ہیں انکی شخصیت کا زیادہ دلکش پہلو ان کے احاطہ کی تصویر سے اُبھرتا ہے۔ جس کا بیان پریم چند اس طرح کرتے ہیں:۔

"مرزا خورشید کا احاطہ کلب بھی ہے۔ کچہری بھی اور اکھاڑا بھی، دن بھر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ محلے میں اکھاڑے کے لیئے جگہ نہ ملتی تھی مرزا نے ایک چھپر ڈلوا کر اکھاڑا بنوا دیا ہے۔ وہاں روز سو پچاس کشتی باز جمع ہو جاتے ہیں۔ مرزا بھی ان کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں۔ محلے کی پنچایتیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ میاں بیوی، ساس بہو اور بھائی بھائی کے جھگڑوں بکھیڑوں کا یہیں نبٹارا ہوتا ہے۔ محلے کی سوشل زندگی کا یہی مرکز ہے اور سیاسی تحریک کا بھی۔ آئے دن سبھائیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں والنٹیر ٹھہرتے ہیں۔ یہیں ان کا پروگرام بنتا ہے۔ یہیں سے شہر کی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے پچھلے جلسے میں مالتی شہری کانگریس کمیٹی کی صدر چن لی گئی ہے۔ جب سے اس مقام کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔"

یہاں مزدوروں کے مخصوص مسائل کے بجائے سوشیل لائف کا ذکر زیادہ ہے ان کے کردار میں ان کا اصل بیٹ ابھرتا نہیں۔

مسٹر ٹنخا:۔

مسٹر ٹنخا ایک عیار کردار ہے جو ہر موقع سے فائدہ اٹھانے اور سودا پٹانے کے چکر میں رہتا ہے اس کے اندر خلوص اور انسانیت کی واضح کمی ہے۔ اس کا پیشہ یہ ہے کہ دو راجاؤں یا مالداروں کو الکشن لڑادے ایک سے مل کر وعدہ کرے کہ میں آپ کو جتادوں گا اور دوسرے سے مل کر اس کو اپنے اعتماد میں لے لے۔ اس طرح منافقانہ کردار کے ذریعہ بھی ایک طرف سے کبھی دونوں طرف سے وہ پیسے بنا لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دھوکہ، دلالی، لفاظی، جھوٹے وعدہ اور اپنی ذہانت کے غلط استعمال سے وہ روزی کماتا ہے۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کیلئے اونچے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے مسائل میں شریک رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ شکاری چڑیا کی طرح موقع کا منتظر رہتا ہے۔ بلکہ شکار پھنسانے کے چکر میں رہتا ہے۔ جہاں موقع آتا ہے وہ فوراً برمحل وار کرتا ہے اور اپنے پیسوں کا معاملہ درست کر لیتا ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی اصول ہے اور نہ نظریہ۔ وہ ابن الوقت ہے جو خود غرضی، مطلب پرستی اور زرپرستی کے گرد گھومتا ہے۔ نہ وعدہ اس کے یہاں کسی معنی کا حامل ہے اور نہ دوستی اس کی نظر میں کوئی قیمت رکھتی ہے۔ اس کے کردار کا ایک نقشہ پریم چند ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

ٹنخا صاحب بڑے، کاٹ پیچ کے آدمی تھے سودا پٹانے میں معاملہ

سلجھانے میں، اڑنگا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کہیئے تو ریت میں ناؤ چلا دیں، پتھر پر دوب اگا دیں۔ تعلقداروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا، نئی کمپنیاں کھولنا، چناؤ کے وقت امیدوار کھڑے کرنا یہی سب ان کا کام تھا۔ خاص کر چناؤ کے وقت ان کی قسمت چمک اٹھتی تھی۔ کسی مالدار امیدوار کو کھڑا کرتے، دل و جان سے اس کا کام کرتے اور دس بیس ہزار بنا لیتے۔ جب کانگریس کا زور تھا تو کانگریسی امیدوار کے مددگار تھے۔ جب فرقہ وارانہ جماعت کا زور ہوا تو ہندو مہا سبھا کی طرف سے کام کرنے لگے" (ص ۱۵۲)

علی عباس حسینی نے ہوری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ زمینداری ختم ہو گئی لہٰذا اس کے کردار کی عظمت بھی کم ہو گئی مگر مسٹر کھنّا کا کردار زندہ رہنے والا ہے۔ میں نے کچھ بحث اس سلسلہ میں پہلے کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمینداری تو ختم ہو گئی مگر کسان کبھی ختم نہیں ہو گا۔ البتہ ٹنکھا جن راجوں اور جاگیرداروں کو الکشن لڑا کر اپنی جیب بھرا کرتے تھے۔ وہ یقیناً ختم ہو گئے۔ جن دلائل سے وہ ہوری کے کردار کو مجروح کرتے ہیں وہی دلائل خود مسٹر ٹنکھا کے وجود کو معرض خطر میں ڈال دیتے ہیں۔

دراصل ان دونوں کرداروں کا مقابلہ کرنا فی نفسہٖ غلط ہے۔ ہوری مقصود بالذات کردار ہے۔ جس کے گرد ناول گھومتا ہے۔ ٹنکھا ضمنی کردار ہے۔ ہوری دیہاتی زندگی سے متعلق ہے جو ناول کا اصل مقصد ہے، مگر ٹنکھا صرف شہری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور ناول میں اس کا ذکر کہیں کہیں آیا ہے۔ اسلیئے اس کو گئودان میں زندہ رہنے والے

کرداروں میں شمار کرنا ناول کی عظمت و اہمیت کا ایک غلط رُخ پیش کرنا ہے۔

ٹُنٹخا مختلف مواقع پر دو اشخاص میں لڑائی، چغلی اور دھوکے کے ذریعہ کبھی ایک اور کبھی دونوں سے روپیے مار لینے کا پیشہ کرتے تھے۔ ناول کے آخر میں ان کا اصل منافقانہ کردار واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ٹُنٹخا گئے تھے رائے صاحب سے راجا پرتاپ کی برائی کرنے اور اسی موقع پر جب وہ "مشغول بدی" تھے۔ راجا پرتاب سنگھ آگئے۔ ٹُنٹخا کا منہ سوکھ گیا۔ راجا صاحب مسٹر ٹُنٹخا سے بولے تم نے "اس دعوت کے کل روپیے وصول کر لیئے اور ہوٹل والوں کو ایک پائی نہ دی اب وہ میرا سر کھا رہے ہیں میں اسے دغا سمجھتا ہوں چاہوں تو ابھی تمھیں پولس کے حوالہ کر دوں" (ص ۵۲۹)

یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب نے رائے صاحب سے اسکے کردار کی وضاحت ان الفاظ میں کی "ایسا بے ایمان آدمی میں نے نہیں دیکھا، رائے صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی آپ کے مقابلہ میں نہ کھڑا ہوتا مگر مجھے اس شیطان نے بہکایا اور میرے ایک لاکھ روپیے برباد کرا دیئے۔ بنگلہ خرید لیا، موٹر رکھ لی، ایک بیوہ سے آشنائی بھی کر رکھی ہے، پورے رئیس بنے ہوئے ہیں اور اب دغابازی شروع کی ہے۔ رئیسوں کی شان نباہنے کے لیئے ریاست چاہیئے اور آپ کی ریاست اپنے احباب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے" (ص ۵۳۰)

رائے صاحب نے ٹنخا سے پوچھا کہ آپ تو کہتے تھے کہ راجا صاحب نے آپ کا محنتانہ ہضم کر لیا۔ اب جواب دیجئے مسٹر ٹنخا نے سر جھکا لیا اور پھر چپکے سے چلے گئے۔ اس لئے کہ یہی ان کا اصل کردار تھا۔

بلاشبہ ایسے بدکردار بدفطرت لڑانے والے اور دو دوستوں کے درمیان جھگڑا اور ناخوشگواری پیدا کرنے والے منافق ہر سماج میں اور ہر جگہ موجود ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کیلئے فساد کے بیج بوتے پھرتے ہیں۔ ایسے بدکرداروں کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے اور نہ کوئی مذہب۔ یہ ہر جگہ اپنا الّو سیدھا کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ انسانوں کے قاتل اور اخلاق و ایمان کے دشمن ہیں۔ ایسے لڑانے والوں سے آج پورا معاشرہ گندہ ہو گیا ہے۔ یہ ٹنخے سوسائٹی کا ناسور ہیں۔ یہ خود گندے ہیں اور اپنا خبث نفس معاشرہ میں پھیلاتے ہیں۔ ٹنخا بدترین کردار کا انسان ہے جو میاں بیوی بھائی بھائی اور دوست دوست کو الگ کرانے اور تفرقہ و نفرت پھیلانے کا کام کرتا ہے۔ وہ بدنفسی کے ذریعہ حصول رزق کرتا ہے۔ ایسے بدنفس اور منافق انسانیت فروشی پر جیتے ہیں۔ اگر پریم چند اس کردار کو اور تفصیل سے پیش کرتے تو یہ ابدیت اختیار کر سکتا تھا مگر انھوں نے اس کو ضمنی طور پر اور نہایت مختصر انداز سے پیش کیا ہے اس لئے یہ زیادہ نمایاں نہ ہو سکا

اونکار ناتھ :-

اونکار ناتھ کے کردار میں ایڈیٹروں کی نفسیات کی بڑی ترجمانی ملتی ہے۔ ایڈیٹر بیچارہ عجیب و غریب حالات سے گذرتا ہے۔ اسے ایک جانب رائے عامہ کا لحاظ کرنا پڑتا ہے اور دوسری جانب وہ اپنے منافع اور مادی بہبودی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ مقاصد پیش نظر رکھ کر اخبار یا رسالہ نکالتا ہے۔ مگر ان اصولوں پر جمنا اور انھیں نبھانا اس کے لیئے بڑا مشکل عمل بن جاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مادی فوائد اصولوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس قسم کی مشکل سے اونکار ناتھ دوچار نظر آتے ہیں۔

وہ ایک جانب کانگریسی عوام کے خیر خواہ ہیں اور تحریک عدم موالات میں شریک ہیں مگر دوسری جانب ان کو مادی منفعتوں کے پیش نظر بدیسی مال کا اشتہار اپنے اخبار میں چھاپنا پڑتا ہے وہ اس قربانی کیلئے تیار نہیں کہ اصول کی خاطر مادی منافع کو ضائع کر دیں۔ یہ منافقت ہے اور ایسی منافقت اکثر ایڈیٹروں میں پائی جاتی ہے۔

ان کے کردار کا سب سے بڑا عیب کسانوں کے مظالم کی داستان کو چھپانا اور رائے صاحب سے رشوت قبول کرنا ہے۔ اگرچہ رائے صاحب نے زبانی گفتگو کی تھی کہ وہ سو خریداروں کا چندہ ادا کر دیں گے بشرطیکہ اس جرمانہ کی خبر اخبار میں نہ چھاپی جائے۔

جو انھوں نے کسانوں سے وصول کی تھی۔

رائے صاحب ایک چالاک آدمی تھے انھوں نے ایڈیٹر صاحب کو پہلے دھمکا کر اور پھر خریداروں کا لالچ دلا کر پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ مالی نفع کا سبز باغ آتے ہی ایڈیٹر صاحب کا انداز بدل جاتا ہے۔ لہجہ میں نرمی اور طبیعت میں لطافت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ہے نفسیات ایک ایڈیٹر کی جو بڑے عمدہ انداز سے پریم چند نے پیش کی ہے۔

اونکار ناتھ مزدوروں کے ہمدرد ہوں یا نہ ہوں مگر وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مزدور ان کے اخبار کو خریدیں اور اسٹرائک کے حالات معلوم کریں۔ ان کو اسٹرائک کی کامیابی کا خیال کم ہے مگر اخبار کے بکنے کا تصور زیادہ ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ اخبار ہزاروں کی تعداد میں نکل جائے۔

اونکار ناتھ جس پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کی نفسیات کا بڑا عمدہ بیان پریم چند نے کیا ہے۔ مگر اس میں کمی تفصیل کی ہے چونکہ یہ ضمنی کرداروں میں سے ہے۔ اس لیئے انھوں نے اس کو نہایت مختصراً اور حسب موقع کہیں کہیں پیش کیا ہے۔

ٹھنّہ :-

ٹھنّہ کا کردار ایک سردارانہ ذہنیت کا عمدہ نمونہ ہے وہ پیسے کے پجاری، دولت کے بھوکے اور مزدوروں کے دشمن ہیں۔ انھوں نے اپنے شکر مِل میں ایسے باٹ بنوا رکھے ہیں جو وزن میں کم ہیں انہیں چھوٹے باٹوں سے کسانوں کی ایکھ کو ناپتے ہیں اور ان کے خون پسینے کی کمائی پر مستقل طور پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ وہ لکھ پتی ہیں کاروں میں پھرتے ہیں کوٹھی میں رہتے ہیں۔ ہزاروں پر حکومت کرتے ہیں تعلیم یافتہ اور شکلاً خوبصورت ہیں مگر ان کے دل کا کھوٹ ان کے کردار پر منعکس نظر آتا ہے۔ پریم چند نے ان کی بے ایمانی کے باعث ان کی شکر مل کو آگ لگوادی۔ آن کی آن میں ٹھنّہ لکھ پتی سے فقیر بن جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی مقدس بیوی گوبندی کہتی ہے کہ اب آپ کا دھیان بھگوان کی طرف ہو گا اور آپ لالچ اور دنیادی بکھیڑوں سے اپنے دل کو پاک کر سکیں گے۔ ان کے اندر یہ تضاد ہے کہ وہ ایک جانب مذہبی ہیں اور دوسری جانب غریبوں اور مزدوروں کا خون چوستے ہیں اور تیسری جانب ریاکاری، عیش پسندی اور لذت پرستی کے دلدادہ ہیں۔ تیاگ اور لذت پرستی باہم کیوں کر جمع ہو سکتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر سرمایہ دار ذہنیت کے حامل ہیں۔ ان کے اندر وہ تمام عیوب ہیں جو عیش پرستی اور عیاری کے باعث سرمایہ داروں میں پائے جاتے ہیں۔

ان کے کردار میں ایک اور تضاد ہے ان کو خوب معلوم ہے کہ وہ گوبندی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ وہ اتنی شوہر پرست، وفادار اور جاں نثار عورت کی محبّت و محنت کی قدر نہیں کرتے انھوں نے کبھی اس کی جانب دلکشی سے نہیں دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ دوسری عورتوں کی تلاش میں وقت ضائع کیا۔ انھوں نے مِس مالتی سے اتنے تعلقات بڑھائے کہ گوبندی کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہونے لگی۔

کھنّا کے کردار میں معاشرہ کے اہم عقدہ کی ترجمانی ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اچھی وفادار بیویاں رکھتے ہیں مگر ان کی نیت خراب رہتی ہے۔ ان کی نظر بد نظری کی تلاش میں رہتی ہے اور ان کے اندر وہ کردار کی عظمت پیدا نہیں ہوتی جو ایک دلکش رفیقۂ حیات کی وفاداری و جاں نثاری کا تقاضہ ہے۔ گوبندی سب جانتی ہے کھنّا کے سارے غلط انداز سے واقف ہے اس کی بے التفاتی کی شاکی ہے مگر وہ کبھی اس کا ساتھ چھوڑنے کیلئے راضی نہیں۔ گوبندی کا کردار صحیح وفادار ہندوستانی عورت کا کردار ہے جو ہر حالت میں شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ چاہے وہ اس کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھتا ہو۔

گئو دان : تصنیف یا ترجمہ؟

از پروفیسر مسعود حسین خاں ایم - اے - پی ایچ ڈی - ڈی لٹ -

گئو دان باتفاق رائے اُردو کا بہترین ناول تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

مسئلہ لیکن کیا گئو دان پریم چند کے قلم سے نکلی ہوئی تصنیف ہے یا یہ ترجمہ ہے ان کے ہندی ناول "گودان" کا جو ان کے ایک دوست اور مددگار اقبال ورما سحر ہتگامی نے کیا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اسکا اردو قالب سحر نے تیار کیا ہے اور پریم چند نے صرف نظرثانی کی ہے تو گئو دان کو اردو کی اصل تصنیف قرار نہیں دیا جاسکتا اور نتیجتہً اسے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں محض تراجم کی فہرست میں رکھنا ہوگا۔ ترجمہ بہرحال ترجمہ ہے وہ چاہے انگریزی سے کیا گیا ہو یا ہندی سے ادبی نقطۂ نظر سے وہ اسی زبان کی تاریخ ادب کا شاہکار کہلائے گا جس میں اصل تصنیف موجود ہے۔

پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو نویسی سے کیا۔ یہی انکی پہلی زبان تھی[1]۔ امرت رائے کی شہادت کے مطابق ہم خرما و ہم ثواب (۱۹۰۶ء) جلوۂ ایثار (۱۹۱۲ء) بازارِ حسن (۱۹۱۷ء) گوشۂ عافیت (۱۹۲۱ء) اور چوگانِ ہستی (۱۹۲۴ء) پہلے اُردو میں لکھے گئے اور بعد کو

---

[1] تاہم امرت رائے کے مطابق ہندی میں ان کا ناول "پریما" ہم ۱۹۰۰ء میں لکھا گیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ قلم کا سپاہی ص ۶۵۳

ان کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ ناول اردو میں پہلے لکھا گیا لیکن اس کا ہندی ترجمہ اردو اصل سے قبل شائع ہو گیا ہے، مثلاً بازارِ حسن[1]۔

پردہ مجاز (آغاز تصنیف ۱۰ر اپریل ۱۹۲۴ء) سے پریم چند کے لکھنے کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ چنانچہ اس ناول کے علاوہ نرملا (۱۹۲۶ء) بیوہ (۱۹۲۷ء)، غبن (۱۹۳۱ء)، میدانِ عمل (۱۹۳۲ء) گئودان (۱۹۳۶ء) پہلے ہندی میں لکھے گئے اور اردو میں ان کا ترجمہ بعد کو ہوا۔ پریم چند کے آخری نامکمل ہندی ناول "منگل سوتر" کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ پریم چند کے آخری دور کے ناولوں کے پہلے ہندی میں لکھے جانے کی تصدیق خود پریم چند نے ان الفاظ میں کی ہے :-

"۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ زمانہ میں لکھتا رہا۔ کئی سال تک متفرق مضامین لکھے ۱۹۰۷ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازارِ حسن لکھا۔ ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم، کایا کلپ چاروں ناول دو دو سال کے وقفے کے بعد نکلے ان کے اردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے۔

(خط مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۲۶ء)

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھئے قلم کا سپاہی: ضمیمہ ۲۔ بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، پردہ مجاز۔

پریم چند کے ان اردو ترجموں کے پس پردہ منشی اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی کا ہاتھ رہا ہے۔ اقبال ورما سحر کی اسی ادبی حصہ داری کا پتہ چلانا فی الحال ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

خارجی شواہد اقبال ورما سحر سے پریم چند کے اس قسم کے کاروبار کی جانب ہمیں پہلا اشارہ پریم چند کے جگری دوست دیا نرائن نگم، ایڈیٹر، زمانہ کی تحریروں میں ملتا ہے۔

"۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول گئودان (گودان ہونا چاہیئے[1] ۔گئودان) بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا۔"[2]

اتفاق سے دیا نرائن نگم کے اس مضمون کی صحیح تاریخ تصنیف کا علم نہیں سوائے اس کے کہ یہ زمانہ کے پریم چند نمبر میں (جس کا سنہ اشاعت ندارد ہے) شائع ہوا ہے۔ امرت رائے کے مطابق گودان جون ۱۹۳۶ء میں یعنی پریم چند کی وفات سے تقریباً تین ماہ قبل شائع ہوا ہے، اس لیے دیا نرائن نگم کا یہ مضمون گودان اور گئودان کی اشاعت کے درمیانی دور کی تحریر ہے۔

---

[1] گئودان اور گودان میں خود پریم چند اپنے خطوط میں غتر بود کرتے رہے ہیں حالانکہ میرے خیال میں ذم کا پہلو نکلنے کی وجہ سے انھوں نے اردو میں گئودان کو گودان پر ترجیح دی ہے۔ گئودان گردان ہی کا تدبھو ہے۔ [2] پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات: زمانہ (پریم چند نمبر) ص ۹۰

اقبال ورما سحر سے پریم چند کے ادبی کاروبار کی تصدیق ان کے کئی خطوط سے بھی ہوتی ہے جو "پریم چند کے خطوط" کے نام سے مدن گوپال نے شائع کیے ہیں ؛ ۱۹۲۵ء کے ایک خط میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں[1]۔

"..... حضرت سحر نے رنگ بھومی کا اُردو ترجمہ کر دیا۔

مگر معاوضہ ہندی صفحات پر ۸ر فی صفحہ مانگتے ہیں یعنی کل ۶۵۰ روپے۔
دیانرائن نگم کو ۲۰ر اگست ۱۹۲۵ء کے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"حضرت سحر کی کتابیں پارسل سے روانہ کر دی ہیں.....
انھوں نے کچھ غلطیاں نکالی ہیں۔ غلط نامہ لگوانا چاہتے ہیں۔ مجھے فضول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر انھوں نے اصرار کیا تو ایک غلط نامہ لگوانا ہی پڑے گا"۔

۱۱ر ستمبر ۱۹۳۱ء کے خط میں دیا نرائن نگم کو ایک بار پھر لکھا ہے :۔

"حضرت سحر کو میں نے ۲۰۰ دینا طے کر لیا ہے[2]۔ وہ راضی بھی ہو گئے..... راضی ہوں تو گوشہ عافیت بھی ان سے پورا کروالوں"۔

ان اشاروں کی بھرپور تصدیق اقبال ورما سحر کے خود نوشت حالات زندگی سے ہو جاتی ہے جس کے بارے میں گئودان پر میرے ایک مختصر مضمون کے جواب میں دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب نے مراسلہ کی شکل میں پہلی بار یہ اہم معلومات فراہم کی ہے[3]۔

---

[1] پریم چند۔ گ خطوط ص ۱۷۱ [2] قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غبن کا معاوضہ ہے۔
[3] دیکھیے ہماری زبان شمارہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲۲ر جنوری ۱۹۷۱ء

"میرے پاس سورگیہ اقبال بہادر ورماسحرؔ ہتسگامی کے مختصر خود نوشت حالات محفوظ ہیں جو اُن کے صاحبزادے سورگیہ کیلاش ورما شائق شاگرد حضرت جگر بریلوی نے اپنے والدِ مرحوم کی وفات، ۲۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کے ایک ماہ بعد جگر صاحب کی خدمت میں اس لئے بھیجے تھے کہ وہ والدِ مرحوم کی یاد میں ایک مقالہ جگر صاحب سے لکھانا چاہتے تھے"۔

اس کے بعد نریندر پرشاد سکینہ صاحب نے سحر صاحب کے خود نوشت حالات سے حسبِ ذیل اقتباسات نقل کئے ہیں۔

"پورا نام اقبال بہادر ورماسحرؔ، مگر مختصراً اقبال ورماسحرؔ لکھتا ہوں۔ والد کا نام منشی شیو نرائن لال مرحوم رئیس و زمیندار، سکونت قصبہ ہنسگام ضلع فتحپور جہاں سالہا سال پہلے کائستھوں کی بہت بڑی آبادی تھی جو سب کے سب عموماً زمیندار تھے مگر اب یہ قدیم قصبہ ایک مدت سے اجڑی ہوئی حالت میں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قصبہ کو راجہ جے چند والیٔ قنوج نے آباد کیا تھا......"

آگے چل کر اقبال ورماسحرؔ پریم چند کے تعلق سے خود نوشت میں یوں رقمطراز ہیں۔
"منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصّے اور کئی ناول مثلاً رنگ بھوم[1]

---

[1] چوگان ہستی۔

کرم بھومی[1] - پریم آشرم[2] - نرملا وغیرہ ہندی سے اردو میں لکھے۔ ابھی ان کا آخری ناول گئودان (گودان ہونا چاہیئے: مسعود) بھی جامعۂ ملیہ سے شائع ہو چکا ہے جسکا اردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے"۔

اسی مضمون کے آخر میں گئودان کے اردو مسودہ کے بارے میں ویریندر پرشاد سکسینہ نے لکھا ہے۔

گئودان کا وہ مسودہ جس کا ترجمہ سحر ہتگامی مرحوم نے ہندی سے اردو میں کیا تھا اور اسی پر منشی پریم چند نے خود نظر ثانی کی تھی۔ سحر صاحب کے خاندان والوں سے حاصل کر کے کسی لائبریری میں محفوظ کر لینا چاہیئے جس سے گئودان کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے[3]

اقبال ورما سحر کے مذکورہ بالا تحریری دعوے اور دیا نرائن نگم کی شہادت کے بعد یہ قیاس کرنا کہ سحر کا دعوٰے مشتبہ ہے' قدرے زیادتی ہوگی۔ سحر کی امانیت پر اگر شبہ کی گنجائش نکل بھی آئے تو دیا نرائن نگم کی شہادت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند اپنی تصانیف کا اردو ترجمہ بیشتر دوسروں سے کراتے رہے ہیں۔

اردو محققین کا یہ خیال غلط ہے کہ پریم چند نے ہندی میں

۱۔ میدان عمل ۲۔ گوشہ عافیت ۳۔ ویریندر سکسینہ اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ گئودان کا یہ مسودہ ابھی تک ان کے اہل خاندان کے پاس موجود ہے یا نہیں جبکہ ہندی گودان کا مسودہ بھارت کلا بھون بنارس میں محفوظ ہے۔

لکھنا بعد کو شروع کیا۔ پریما (۱۹۰۴ء) کی موجودگی سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ ابتدا سے اُردو کے ساتھ ہندی میں لکھتے رہے ہیں۔ کبھی اُردو میں پہلے لکھ کر ترجمہ خود ہندی میں کرتے، کبھی ہندی میں پہلے لکھ کر اس کا اردو ترجمہ آپ کرتے یا دوسروں سے کرواتے اور خود نظرثانی کرتے گئودان کے اردو ترجمہ پر وہ اپنی مسلسل علالت کے باعث نظرثانی کیلئے زیادہ وقت نہ نکال سکے۔ اسی وجہ سے ہم نے گئودان کے ترجمہ ہونے کا سوال سب سے پہلے اٹھایا ہے لیکن ان خطوط پر تحقیق کی توسیع رنگ بھوم (چوگانِ ہستی)، کرم بھوم (میدانِ عمل)، پریم آشرم (گوشۂ عافیت) اور نرملا کی جانب بھی کی جاسکتی ہے فی الحال ہم اپنی بحث کو گئودان تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری ناولوں کے بارے میں سحر کے دعویٰ پر شہادت "پریم چند کے خطوط" کے مؤلف مدن گوپال کی بھی ملتی ہے۔

"یہیں لکھنؤ میں پریم چند نے اپنا اگلا ناول شروع کیا۔ یہ اولاً ہندی میں لکھا گیا۔ اس کا نام تھا کایا کلپ[1]۔ کچھ سال بعد یہ اُردو میں پردۂ مجاز کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ پریم چند نے خود ہندی سے اردو میں کیا۔ مگر رنگ بھومی اور چوگانِ ہستی میں اتنا اختلاف تھا کہ چوگانِ ہستی کا دوسرا مسودہ ہندی ناول سے ترجمہ کروانا پڑا۔ اسے پریم چند نے اقبال ورما سحر ہتگامی سے کروایا۔"

۱؎ "مول پانڈولپی ہندی میں...... ۱۰ اپریل ۱۹۲۴ء کو شروع ہوا...... پرکاشن ۱۹۲۶ء میں ہوا۔" 'قلم کا سپاہی' ص ۶۵۵

اس سلسلے میں پریم چند کے قلم سے مزید شہادت ۸ر مئی ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں ملتی ہے[1]

"اردو تصانیف، ہندی کا ہی ترجمہ ہیں۔

پریم چند اپنی اردو تصانیف کے سلسلے میں کسی نہ کسی مترجم کی مدد دراصل ہمیشہ لیتے رہے ہیں۔ جب واقعہ کربلا پر تاریخی ڈرامہ ہندی میں لکھا تو اس کے ابتدائی حصص کا ترجمہ بھی خود نہیں کیا۔ بلکہ ایک اور صاحب سے کروایا۔ ۲ر اگست ۱۹۲۴ء کو دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:-

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندی سے خود ترجمہ نہیں کیا ہے۔ میرے ایک نارمل اسکول کے دوست منشی میر حمید صاحب قریشی ہیں، انھیں سے کرالیا ہے۔ اب بقیہ حصوں کا ترجمہ میں خود کردوں گا......"[2]

گودان تا گئودان

پریم چند کا انتقال ۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ ہندی گودان کی تاریخ اشاعت جون ۱۹۳۶ء بتائی گئی ہے[3]۔ امرت رائے کے مطابق گودان کی تصنیف کا آغاز تو ۱۹۳۲ء میں ہو گیا تھا۔ لیکن رسالہ ہنس اور جاگرن کے سلسلے میں ان کی مالی پریشانیاں اور پھر بمبئی کی فلمی دنیا میں سال بھر کے قریب ان کے قیام کی وجہ سے اس کی تصنیف کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اس طرح یہ ناول دراصل اپریل ۱۹۳۵ء تا اپریل ۱۹۳۶ء کے درمیان مکمل ہوا ہے۔ جب

۱۔ بنام کیشورام سبھروال (بزبان انگریزی)، پریم چند کے خطوط ص ۱۸۰ ۲۔ پریم چند کے خطوط ص ۱۶۷ ۳۔ قلم کا سپاہی ص ۶۵۶

پریم چند فلمی دنیا سے ناکام و نامراد واپس آکر ہمہ تن تصنیفی زندگی میں منہمک ہو گئے۔ اس دوران میں مالی پریشانیوں کے علاوہ ان کی صحت بھی دگرگوں رہی تاآں کہ جون ۱۹۳۶ء میں خونی قے کے بعد تو وہ شکلِ بستر بن کر رہ گئے تھے۔ اس طرح گودان کی تصنیف کا زمانہ سمٹ کر ایک سال رہ جاتا ہے۔ ان کی اس زمانے کی پریشانیوں کا اندازہ ذیل کے خط سے کیا جا سکتا ہے۔ جو انھوں نے ۷؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو جینیندر کمار کو لکھا ہے:۔

"روپے کے رشتے میں کیا لکھوں ...... میں تو پانچ مہینے میں ایک پیسہ بھی نہ کما سکا۔ بمبئی سے تھوڑے پیسے لایا تھا۔ وہ پانچ مہینے میں کھا گیا اور کچھ قرض چکا دیا...... اب ابھی چنتا میں گھل رہا ہوں کہ آگے کیا ہو گا...... [1]"

بے بسی اور کس مپرسی کا جو عالم اس خط میں ملتا ہے اس میں اور گئودان کے عظیم کردار ہوری کی ناکام زندگی میں کس قدر مطابقت پائی جاتی ہے! ان حالات میں پریم چند اردو گئودان کے ترجمے پر کس قدر وقت صرف کر سکے ہوں گے، یہ مشتبہ ہے۔ اس کام میں ان کا شریک غالب اقبال ورما سحر ہی کو ماننا پڑے گا۔

اردو گئودان پریم چند کے مکاتیب کی روشنی میں جولائی ۱۹۳۶ء میں پریس کیلئے تیار تھا۔ اختر حسین رائے پوری کو اسی ماہ [2] میں لکھتے ہیں:۔

۱۔ اصل خط ہندی میں: پریم چند کے خطوط: ص ۳۶۷ ۲۔ اسی ماہ اس لئے کہ خط پر مہینہ اور تاریخ نہیں دی ہوئی ہے لیکن خط ۹؍جولائی ۱۹۳۶ء کے ایک خط کے بعد ترتیب میں رکھا گیا ہے۔ پریم چند کے خطوط، ص ۳۸۵

"میرا نیا ناول گودان حال ہی میں نکلا ہے۔ اس کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ اُردو میں ریویو کرنا..... گودان کیلئے ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں، مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے تم جانتے ہی ہو، بہت ہوا تو ایک روپیہ صفحہ کوئی دے دے گا۔"

داخلی شواہد مذکورہ بالا خارجی شواہد کی بناء پر اب ہم یہ بات کسی قدر قطعیت سے کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند اور اقبال ورما سحر کے درمیان ادبی کاروبار رہا ہے اور سحر کے اس دعوے میں صداقت پائی جاتی ہے کہ انھوں نے مترجم کی حیثیت سے آخری دور میں پریم چند کا مسلسل ہاتھ بٹایا ہے۔ بالخصوص گودان کے اُردو ترجمے میں ان کا حصہ شریک غالب کا ہے۔

ان خارجی شواہد کی تصدیق گئودان اور گئودان کی زبان کے تقابلی مطالعہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ ہر چند ہندی اور اُردو میں ترجمہ کا وہ پردہ حائل نہیں جو دوسری دو زبانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ بہرحال یہ دونوں زبانیں ایک ہی کان کے دو گوہر ہیں ایک ہی صدف کے دو موتی ہیں اور ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں۔ اس لئے قواعد کی سطح پر اختلافات کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ البتہ یہ اختلافات لفظیات اور اسلوبیات کی سطح پر بہت واضح ہیں۔ پریم چند اور اقبال ورما سحر دونوں کائستھ تھے۔ دونوں کو ہر دو زبانوں پر عبور حاصل تھا، دونوں ہی پیوندی زبان کے عادی اور رسیا تھے۔

پریم چند کی طرح سحر بھی مضمون نگار کی حیثیت سے رسالہ زمانہ سے وابستہ رہے لیکن پریم چند کو سحر پر یقیناً فوقیت حاصل تھی اس لئے کہ وہ دونوں زبانوں کے تخلیقی فن کار تھے۔ پریم چند نے نہ صرف اردو افسانوی ادب کو بلکہ اس کی زبان کو بھی دہلی و لکھنؤ کے تنگ نائے سے باہر نکال کر دیہات کے کھلے آنگن میں لا کھڑا کیا۔ میرے خیال میں اس اعتبار سے پریم چند نے اردو زبان کی جس قدر توسیع کی ہے اور اسے مرکزیت، کے دائرہ سے باہر نکالنے میں جو سعی کی ہے۔ اس کی نظیر دوسری جگہ ملنی دشوار ہے لیکن ان کے اس "لامرکزیت" کے رجحان نے معیاری، زبان کے لئے مسائل بھی پیدا کئے ہیں۔ گئودان کا چونکہ بیشتر حصہ دیہاتی مکالموں سے بھرا ہوا ہے اس لئے اس ناول کے مکالمات کی زبان میں اردو نے اپنی آخری دیہاتی حدوں کو چھو لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گئودان ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اصل تصنیف (گودان) سے بہت قریب ہے۔ پریم چند کی اردو ناولوں کے بارے میں عام خیال کہ وہ محض نقل لفظی کی زائیدہ ہیں بہت غلط ہے۔ اس عام خیال کو تقویت گئودان ہی کی زبان ملی ہے۔ اس لئے کہ یہ امر واقعہ ہے کہ گئودان لسانی اعتبار سے جس قدر گودان سے قریب ہے نہ تو گوشہ عافیت پریم آشرم سے ہے اور نہ چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل، رنگ بھوم اور کرم بھوم سے۔

گئودان، گودان سے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے فقروں اور تراکیب میں "ترجمہ پن" کی کیفیت رکھتا ہے، جو دیہاتی کرداروں کی بات چیت میں نہیں لیکن شہری کرداروں کے مکالمات اور

بالخصوص مصنف کے اپنے خیالات کے اظہار میں جا بجا نمایاں ہے۔

اِس سے قبل کہ ہم گودان اور گئودان کی زبان کا لسانی مطالعہ الفاظ و تراکیب[1] کے تجزیہ کی شکل میں کریں اسلوب کے نقطۂ نظر سے دونوں ایڈیشنوں کے ایسے فقرے اور جملے پہلو بہ پہلو یکجا کریں گے جن سے گئودان کے ترجمہ ہونے کا یک لخت احساس کیا جا سکے۔

گودان	گئودان
(۱) پرودھا آگھات تو اس مرم استھل پر تھا جہاں جیون کی سمپورن پریرنا سنچیت تھی (ص ۲۷، ۲۴ س ۱۲-۱۳)	(۱) مگر یہ چوٹ تو اس نازک جگہ پر تھی جہاں زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع تھا۔ (ص ۵۱، س ۴-۵)
(۲) اس کے ماتری پد کی رکشا کرتے ہوئے (ص ۱۸۳، س ۲۱)	(۲) اس کے ماں والے درجے کا لحاظ کرتے ہوئے (ص ۲۲۳، س ۳)
(۳) میں اس وشے میں دِرڑھ ہوں (ص ۲۱۲، س ۱۰)	(۳) میں اس بارے میں مستقل ہوں (ص ۲۵۷، س ۹)
(۴) سمپادک جی اوِچل رہے۔ (ص ۲۱۷، س ۲۱)	(۴) ایڈیٹر صاحب مستقل رہے۔ (ص ۲۶۳، س ۱۲)
(۵) ان کی پرتییک گت جنتا پر تی بمبت ہوتی جاتی ہے (ص ۱۹۲، س ۱۷-۱۸)	(۵) ان کی ہر حرکت لوگوں پر منعکس ہوتی جاتی ہے (ص ۲۳۳، س ۱۸)

---

[1] اس مضمون کے سارے اقتباسات حسب ذیل ایڈیشنوں سے لئے گئے ہیں:
گودان، سرسوتی پریس بنارس ۱۹۴۸ء۔ گئودان، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۶۶ء
مخففات:۔ ص = صفحہ س = سطر

(۶) دونوں بچوں کے پیار میں ہی اپنے پتنی ورت کا پالن کیا ہے۔ (ص ۲۱۲، س ۱۵-۱۶)	(۶) دونوں بچوں کے پیار ہی میں میں نے متوفیہ کے متعلق اپنی وفاشعاری کو نبھایا ہے (ص ۲۷۷، س ۱۲-۱۳)
(۷) اب پرواہ استھر اور شانت ہو گیا تھا (ص ۲۳۸، س ۴)	(۷) اب پانی برابر اور برقرار ہو گیا۔ (ص ۳۴۰، س ۲۷-۲۸)
(۸) اور کوئل ... سنگیت کا گپت دان کر رہی تھی (ص ۲۷۱، س ۲۷)	(۸) اور کوئل ..... راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی (ص ۳۲۹، س ۶-۷)
(۹) ایمان سے بھی بڑھ کر دکھ تھا جیون کی سنچت ابھلاشاؤں کے دھول میں مل جانے کا (ص ۲۴۴، س ۷-۸)	(۹) بے عزتی سے بھی زیادہ افسوس تھا زندگی کی مجتمع خواہشات کے خاک میں مل جانے کا (ص ۵۱۵، س ۶-۷)
(۱۰) جیون کی آنند ورتی تو دبائی نہیں جاسکتی (ص ۲۰۸، س ۲۳)	(۱۰) زندگی کی تفریحی رغبتیں تو دبائی نہیں جا سکتیں (ص ۲۵۰، س ۶-۷)
(۱۱) اس کی لالسا پرورتی دن دن بڑھتی گئی (ص ۲۱۲، س ۱۸)	(۱۱) اس کی خونی رغبت روز بروز بڑھتی گئی (ص ۲۵۷، س ۳)
(۱۲) مگر انھوں نے بالکوں کا منھ دیکھا اور ودھر جیون کی سادھنا سویکار کرلی (ص ۲۲۶، س ۶-۷)	(۱۲) مگر انھوں نے لڑکوں کا منھ دیکھا اور تجردانہ زندگی کی مشق و مزاولت قبول کرلی (ص ۵۱۵، س ۱۸)

اسلوب کے اس تفاوت پر کسی قسم کے حاشیے چڑھانے کی ضرورت نہیں جبکہ ہندی الفاظ و تراکیب میں پوری تخلیقی شدت اور محاورہ کی صحت پائی جاتی ہے' زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع'۔ ایڈیٹر

صاحب مستقل رہے" "پانی برابر اور برقرار ہو گیا"۔ "راگوں کی خفیہ خیرات" "زندگی کی مجتمع خواہشات" "تفریحی رغبتیں" "خونی رغبت" چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ ہم کسی تخلیقی عمل کی لہر پہ برآمد نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک مترجم کی کاوش غواصی کے آوردہ ہیں۔

تھوڑی دیر کیلئے پریم چند کے عقیدت مندوں کی خاطر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خود پریم چند نے گودان کو گئودان کا قالب عطا کیا ہے اور اس کے ترجمہ میں زیادہ ہاتھ انھیں کا ہے۔ ایسی صورت میں دو لسانی مصنف ہونے کی وجہ سے گئودان کے متن کا گودان سے تخلیقی عمل کے جوش میں مختلف ہونا ناگزیر تھا جیسا کہ ابھی مذکور ہو چکا ہے کہ رنگ بھوم اور چوگان ہستی کے پہلے مسودہ میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ رنگ بھوم کا دوبارہ ترجمہ کرانا پڑا۔ لیکن گئودان کی عبارت تو لفظ لفظ اور سطر سطر گودان کے سہارے چلتی ہے۔ راقم السطور کو ساری کتاب میں صرف چند مقامات ایسے ملے ہیں جہاں متن کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف کا بھی اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں تخلیقی عمل کے تجاوز یا انحراف سے زیادہ ترجمہ نویسی کا عنصر بود پایا جاتا ہے۔ مثلاً اردو ہندی ایڈیشنوں کی ذیل کی عبارت کا مقابلہ کیجیے:۔

گودان	گئودان
"چاروں اور سے بدھائیاں مل رہی تھیں، تاروں کا تانتا لگا	"چاروں طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔ وقار تو ان کا پہلے بھی

ہوا تھا۔ اس مقدمہ کو جیت کر تعلقداروں کی پرتھم شرینی میں اِستھان پراپت کرلیا تھا۔ سمّان تو ان کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اب اس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ سامیک پتروں میں ان کے چتر اور چرتر دِنا دن نکل رہے تھے۔ قرض کی ماترا بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر اب رائے صاحب کو اس کی پروا نہ تھی"۔

(ص ۲۲۴، س ۲۲ - ۲۹)

کسی سے کم نہ تھا۔ مگر اب تو اس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وقتی اخباروں میں ان کی تصویریں اور سوانح عمری زوروں سے نکل رہی تھی۔ قرض بہت بڑھ گیا تھا مگر اب رائے صاحب کو اس کی پروا نہ تھی۔

ص ۱۱۵، س ۱۳ - ۱۶

خط کشیدہ جملوں کو مترجم نے اردو میں حذف کردیا ہے۔ یہاں "سامیک پتروں" کا ترجمہ "وقتی اخباروں" بھی محل نظر ہے۔ معاصر یا ہم عصر ہونا چاہیے۔

جملوں اور فقروں سے قطع نظر اگر گئو دان کی فرہنگ پر غور کیا جائے تو اس سے بھی مترجم کی کاوش آورد (بعض اوقات غلط حد تک) کا پتہ چلتا ہے۔ (۱) ایک لفظ جو گئو دان میں بار بار آیا ہے وہ پُروشتو (पुरुषत्व) ہے۔ جس کا ترجمہ اردو ایڈیشن میں کبھی مردمی (ص ۱۲۰، س ۷) کبھی مردانگی (ص ۱۲۸، س ۱۲) لیکن زیادہ تر "مردمّیت" (ص ۱۳۲، س ۱۲) ص ۲۷۵، س ۱۴/ ص ۳۰۰، س ۲) کیا گیا ہے۔ اردو کے مستند لغات میں مردانگی، مردمی

مردانیت اور مردپن کے الفاظ ملتے ہیں۱؎۔ مردیّت نہ تو کسی لغت میں ملتا ہے اور نہ استعمال میں سُنا گیا ہے۔ غالباً مترجم خود "مردیت" سے مطمئن نہیں۔ وہ بدل بدل کر کبھی کبھی مردی اور مردانگی کے الفاظ بھی لاتا ہے۔ لیکن مطمئن ان سے بھی نظر نہیں آتا "مردپن" کی ترکیب اس ڈر سے کہ کہیں اردو والے قبول نہ کریں استعمال کرنے کی جرأت نہیں کرتا حالاں کہ یہی لفظ پروشتو سے قریب ترین ہے اس لیے کہ سنسکرت کا لاحقہ (- تو) (त्व) کا ہم معنی /پن/ ہی ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور لفظ "دُنیویّت" (ص ۵۵۵، س ۱۳) ہے جو مترجم کی ہندی لفظ "سانسارکتا" (सांसारिकता) (ص ۸۴۴، س ۱۶) کے لیے گھڑت ہے۔ حالاں کہ اس کے لیے "دنیا پرستی" کا لفظ مقبولِ عام ہے۔

(۲) ایک اور لفظ جو گئودان کے سارے متن میں بکھرا ہوا ملتا ہے۔ "رغبت" اور "راغب" ہے۔ یہ ہندی کے لفظ "وِرتّی" کا ترجمہ ہے۔ مثلاً "ہنسا وِرتّی" (ص ۳۷۸، س ۲) کا ترجمہ "مفسدانہ رغبت" (ص ۵۷۴، س ۱۵) کیا گیا ہے۔ "آکرشت" (ص ۱۹۵، س ۱۱) کا راغب (ص ۲۴۷، س ۴) کیا گیا ہے۔ "ہنسا پرورتّی" (ص ۲۱۲، س ۱۸) کا "خونی رغبت" (ص ۲۵۷، س ۳) کیا گیا ہے۔ "انوراگ" (ص ۳۳۶، س ۸) بھی رغبت (ص ۴۰۷، س ۸) ہے۔ حالاں کہ اُردو میں ان کے لئے میلان، رجحان،

۱؎ دیکھیے فرہنگ آصفیہ و نوراللغات

گشش، جھکاؤ وغیرہ عام مستعمل لفظ موجود ہیں۔ "رغبت" سے مترجم کو اس قدر رغبت ہے کہ وہ اس لفظ میں معنیاتی توسیع کر کے اسے ہندی لفظ "موہ" کا مترادف بھی بنا دیا ہے اور "یہ موہ تو وناش کی جڑھ ہے" کا ترجمہ "یہ انتہائی رغبت ہی تباہی کی جڑ ہے" کرتا ہے۔ رغبت، راغب اور مرغوب کے اس گورکھ دھندے میں مترجم کی کھینچا تانی کا احساس مسلسل ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان فقروں میں تخلیقی فنکار کی آمد اور جوش بالکل مفقود ہے۔

(۳) ایک اور لفظ جو گئودان کی زبان کے سلسلے میں کلید کا حکم رکھتا ہے اودکھ یا ایکھ[1] ہے۔ یہ لفظ دیہاتی ماحول اور پس منظر کی وجہ سے سینکڑوں بار استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہندی میں پریم چند نے ہر جگہ اودکھ کی یکسانیت کو برقرار رکھا ہے۔ دیہاتی کردار ہو کہ شہری یا خود مصنف کی عبارت اور اظہار خیال ہر جگہ "اودکھ" ہی استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن گئودان کا مترجم اس بارے میں مذبذب نظر آتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ غالباً اردو والے اس کی ایکھ شکل سے زیادہ مانوس ہیں[2]۔ اس لیے کسی صفحے پر یہ التزام رکھا گیا ہے کہ دیہاتی مکالمات میں "اودکھ" ہی رہنے دیا ہے اور مصنف کی عبارت میں "ایکھ" کر دیا ہے۔ لیکن ذرا آگے چل کر وہ اس التزام کو ختم کر دیتا ہے اور ایک ہی صفحے پر

---

[1] دونوں لفظ تدبھو ہیں۔ سنسکرت "اِکشُو" کے معیاری ہندی کے قاعدوں میں عموماً (چھ) سے ([illegible]) ہی ملتا ہے۔ [2] اردو لغات میں لفظ کی دونوں شکلیں دی گئی ہیں لیکن اردو والے عام طور پر گنّا اور گنے کی کاشت ہی استعمال کرتے ہیں۔

اوکھ اور ایکھ بہ یک وقت استعمال کرتا ہے۔ مثلاً مصنّف کی زبان میں "اوکھ" کی مثالیں (ص ۲۱۶، س ۱۶) پر اور "ایکھ" کی مثالیں (ص ۲۳۹، س ۱۲) پر مل جائیں گی۔ صفحہ ۲۹۷ پر مترجم "اوکھ" اور "ایکھ" دونوں چند سطروں کے فصل سے لایا ہے۔ گئو دان اگر پریم چند کے قلم سے نکلی ہوتی تو وہ اوکھ اور ایکھ کے استعمال میں کوئی نہ کوئی ترتیب اور التزام ضرور قائم رکھتے۔ مثلاً ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ "اوکھ" دیہاتی کرداروں سے مختص کر دیا جاتا۔ اور "ایکھ" شہری کرداروں کی زبان اور مصنّف کی عبارت تک محدود رہتے لیکن گئو دان میں یہ صورت نہیں ملتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گئودان میں "اوکھ" یکساں طور پر کیوں آیا ہے اور گئو دان میں اوکھ اور ایکھ بے ربط طریقے پر ایک دوسرے سے کیوں آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ مترجم کا قصور نہیں؟

۴۔ ایک اور لفظ جو مترجم کے دستِ غیب کی خبر دیتا ہے لفظ "چڑنا" اور "چڑانا" ہے جو ہندی میں ہر جگہ چڑھنا اور چڑھانا (ص ۵۳۹، س ۵۱) آیا ہے۔ جب کہ ہندی میں /ڑھ/ کی یکسانیت قائم رکھی ہے (مالتی نے چڑھ کر کہا (ص ۵۳۹، س ۱۵) اردو ترجمے میں مترجم اس کی صحت تلفظ کے بارے میں پھر ڈانواں ڈول

۱؎ گئو دان کا پس منظر اودھ کا علاقہ ہے۔ سمری اور بیلاری دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (گئو دان)

نظر آتا ہے۔ بیسویں باب میں دو جگہ یہ لفظ / ھ / کے ساتھ آیا ہے اور دو جگہ اردو میں صحیح تلفظ کے مطابق "چڑنا" یا "چڑانا" بغیر / ھ / کے آیا ہے۔ گئوداں میں "چڑھنا" کے غلط استعمال کی مزید مثالیں (ص ۵۴۴) پر مل جائیں گی۔ ادکھ اور ایکھ کی طرح اس لفظ میں بھی یکسانیت کا فقدان کسی اجنبی کے قلم کی نشان دہی کرتا ہے۔

۵۔ گئوداں کا مترجم غلط استعمالات کا بھی شکار رہا ہے جنہیں پریم چند سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً دنیاوی (ص ۴۶، س ۱۷) حواسوں (ص ۲۱۲، س ۱۸)

غلط محاورات کا استعمال:۔

گئوداں	گوداں
۱۔ اس کا خون اُبل اٹھا۔	۱۔ اس کا رکت کھول رہا تھا
۲۔ روٹیاں بنائی تھیں۔	۲۔ روٹیاں پکائی تھیں

پریم چند نے گوداں میں صحیح محاورہ لکھا ہے۔ لیکن مترجم نے گئوداں میں غلط اردو لکھی ہے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ گئوداں کا مترجم ہمیشہ اس بات پر تلا نظر آتا ہے کہ پریم چند کے عام مستعمل لفظ کا بھی بدل ڈھونڈ نکالے اس رجحان میں اس کی "منشیت" کارفرما ہے۔ مثلاً گوداں کے لفظ "طرح طرح" کو وہ اردو میں اکثر اوقات "انواع واقسام کا" میں بدل دیتا ہے۔ "سماج" کا ترجمہ "جماعت" کرتا ہے۔ "آدرش" کو "معیار" اور "آدرش وادی" کو "معیار پرست" لکھتا ہے" الھڑ سیوا کو

"طفلانہ خدمت" بنا دیتا ہے۔ ایک اور جدّت جو مترجم نے گئو دان کے ترجمے میں کی ہے وہ تلفظات اور مترادفات کے لئے قوسین کا استعمال ہے۔ بعض اوقات' بہ خیالِ خویش' اردو والوں کی سہولت کے لئے دیہاتی مکالمات کے لہجے کو قائم رکھتے ہوئے اردو لفظ کے صحیح تلفظ کو قوسین میں لکھنا ضروری سمجھتا ہے' مثلاً:۔

سیکھی (شیخی) (ص ۲۰۰' س ۱۱)۔ کھیرات (خیرات)، (ص ۷۷' س ۱۱)

بعض اوقات بلاوجہ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ اردو ناظر ہندی کا لفظ نہ سمجھ سکے گا۔ قوسین میں اردو مترادف رکھ دیتا ہے مثلاً:۔

گرِ ھستی (حصالہ) (ص ۷' س ۱۰) سانجھ (شام) (ص ۲۱۷' س ۲)

لالسا (خواہشیں) (ص ۲۰۶' س ۴) نِہولا (تاختوں)، (ص ۳۳۳' س ۹)

سوارتھی (خود غرض) (ص ۹' س ۹)، بیاہنے (جننے) (ص ۱۰' س ۱۳)

یہ لغت کاری کسی زبان کے ناول میں آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔

پریم چند کے ہندی گئو دان کے جملوں کے دروبست میں "حروف کے محذوفات" اور علامات اوقاف کے ماہرانہ استعمال سے اکثر ڈرامائی کیفیت آجاتی ہے۔ اس ڈرامائی کیفیت کو مترجم اردو میں بعض اوقات کاف بیانیہ داخل کرکے یا حروف اور وغیرہ کے استعمال سے بیانیہ انداز دیدیتا ہے۔ مثلاً پریم چند کے ہندی کے وہ جملے جن میں کاف بیانیہ حذف ہے اردو میں جوں کے توں رکھے جاسکتے ہیں لیکن مترجم انھیں کاف بیانیہ سے لکھ کر ان کا سارا حسن ختم کر دیتا ہے۔ مثلاً گوبر نے دیکھا سارا سامان بکھرا پڑا ہے' اردو میں اس طرح لکھا گیا ہے گوبر نے دیکھا کہ سارا سامان بکھرا پڑا ہے' گئو دان میں ایک اور جگہ ایک جملہ اس طرح آیا ہے کہتی ہوں کچھ نہ بولو گی' جسے مترجم نے اردو میں اس طرح لکھ کر کہتی ہوں کہ کچھ نہ بولو گی' جملے کی ساری ڈرامائی بلاغت کا خون کر دیا ہے۔

اس قسم کی مثالیں گئودان سے بکثرت فراہم کی جا سکتی ہیں، جن سے مصنف اور مترجم کا فرق اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

حرفِ آخر

گئودان کے اس تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کا آغاز ہم نے ہماری زبان کے صفحات میں ۱۵ ڈسمبر ۱۹۷۰ء سے کیا تھا۔ اس کے بعد ۸ مئی ۱۹۷۱ء اور ۱۵ جون ۱۹۷۱ء کے شماروں میں دو اور مختصر مضمون اس موضوع پر سپردِ قلم کئے۔ ان مضامین کا ردِعمل کچھ بے سود اور کچھ مفید مطلب رہا۔ اس سلسلے میں سب سے مفید مطلب مراسلہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں دیویندر پرشاد سکسینہ صاحب کا شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے اقبال ورماسحر کے خودنوشت حالاتِ زندگی کے مسودہ کا اتا پتہ دیا جس سے ایک اہم اقتباس ہم اس مضمون کے شروع میں نقل کر چکے ہیں۔ چند مراسلات جذباتی قسم کے بھی آئے جن کا اندازِ بیان یا تو غیر علمی تھا یا غیر معلوماتی۔ علمی تحقیق نہ تو قصیدہ ہوتی ہے اور نہ ہجو اس کا اصل مقصد عقدہ کشائی ہے نہ کہ عقیدت مندی۔ اسی جذبہ سے گئودان کے ترجمہ ہونے کے سوال کو اٹھایا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں دیا نرائن نگم کا وہ جملہ جس میں گودان کے اردو ترجمہ کی بشارت دی گئی تھی[۱]۔ عرصہ دراز سے دماغ میں کھٹکتا رہا اور محرک ثابت ہوا۔ لیکن مزید شواہد حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے یہ اب تک

---

[۱] پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات: زمانہ (پریم چند نمبر: ص ۹)

تفسیر و تشریح سے محروم رہا۔ جوں جوں پریم چند کے بارے میں دیگر مواد (بالخصوص ان کے خطوط) روشنی میں آتا گیا، تصویر واضح ہوتی گئی اور جب ہندی اردو دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مطالعہ کیا تو اس بات کا یقین ہوتا گیا کہ گئودان کے پس پشت کسی غیر کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی گئودان پر مختصر مضامین کا سلسلہ ہماری زبان میں شروع کیا گیا۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب کا وہ مراسلہ شائع ہوا جو ہمارے مقدمے کی اب سب سے اہم شہادت ہے اس میں اب ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ گئودان ترجمہ ہے گودان کا اور گودان پہلے ہندی میں لکھا گیا ہے۔ گو اس کی تصنیف کا آغاز پریم چند ۱۹۳۲ء میں کر چکے تھے لیکن اپنے فلمی دنیا میں چلے جانے کی وجہ سے ناول کا کام ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھ سکا اور بمبئی سے اپریل ۱۹۳۵ء میں واپس آنے کے بعد ہی کئی مہینے کی لگاتار محنت کے بعد ہی وہ اس کام کو پورا کر سکے۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ اردو میں گودان کا ترجمہ خود پریم چند نے نہیں کیا ہے، بلکہ معاوضہ دے کر اقبال ورما سحر سے کروایا ہے۔ ایک ودلسانی مصنف کا تخلیقی عمل اس وقت مجروح ہوتا ہے جب وہ اپنے کسی شاہکار کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے اس وقت اس کا ذہن ترجمہ نگار کے تنگ مترادفاتی اور معنیاتی دائروں میں گھومتا ہے اور اس کے قلم میں وہ روانی اور جولانی نہیں ہوتی جو اصل زبان میں لکھتے وقت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ہندی کے دو لسانی مصنف کو انگریزی اور فرانسیسی یا انگریزی اور اردو کے دو لسانی مصنف کے مقابلے میں بے انتہا سہولتیں حاصل ہیں۔ اس کی فکر ایک ہی قسم کے لسانیاتی سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ صرف و نحو کی سطح پر وہ کم و بیش ایک ہی قسم کے طریق اظہار سے دوچار ہوتا ہے۔ اختلافات نمودار ہوتے ہیں۔ فرہنگ اور اسلوبیات کی سطح پر جا کر اردو کے عربی فارسی الفاظ ایک مخصوص تہذیبی فکر اور ذہن کے غلافوں میں لپٹے ہوئے نمودار ہوتے ہیں پریم چند جب نر ناری، پردشٹو، سانسارک جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان کی معنیاتی جڑیں ہند قدیم اور آریائی تہذیب میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے پیچھے ایک اندازِ فکر ہے۔ ایک نظامِ حیات ہے، ایک نقطۂ نظر ہے۔ لیکن جب یہ اردو کے غلاف پہن کر "نر" "مادہ" "مردیت" اور "دنیویت" کی شکل اختیار کرتے ہیں تو یہ ان تمام خفی معنیاتی لرزشوں سے عاری ہو جاتے ہیں کہ ہر زبان ایک مخصوص تہذیب کی امین ہوتی ہے۔

اس لیے اگر اقبال ورما سحر گئودان کے مترجم نہ ہوتے اور پریم چند خود اس ناول کے مترجم ہوتے تب بھی اس ناول میں ترجمہ کی بو رہ جاتی اور اس کے پیرایہ بیان پر ترجمہ کا ٹھپہ نظر آتا۔ پریم چند کی ان ہندی ناولوں کی زبان پر، جو پریم چند نے پہلے اردو میں لکھی تھیں (ہم خرما و ہم ثواب) (پریما)، بازارِ حسن (سیوا سدن)، گوشۂ عافیت (پریم آشرم) چوگانِ ہستی (رنگ بھوم) اور بعد کو ہندی میں خود ترجمہ کیں، ہندی کے بعض حساس ادیبوں نے اسی لیے چھینٹے مارے ہیں۔

لیکن گئودان کے بارے میں تو خارجی اور داخلی شواہد اس قدر

مضبوط ہیں کہ اسے ترجمہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا، پریم چند کا نہیں بلکہ معاوضہ پر کام کرنے والے اُن کے ایک دوست اقبال ورما سحر کا۔

اِس ترجمہ کی زبان میں پریم چند کا کس قدر حِصّہ ہے۔ اِس کی تشریح بھی ضروری ہے۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری ناولوں کے ترجموں کی مانند پریم چند نے اس ترجمہ پر بھی نظرِ ثانی کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم مبسوط دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ گرتی ہوئی صحت اور مالی پریشانیوں کی وجہ سے پریم چند گئودان کے اُردو ترجمے پر خاطر خواہ نظرِ ثانی نہیں کر سکے ہیں۔ اِسی لئے گئودان کی زبان زیادہ "ہندی" ہے اور غلط استعمالات سے پُر ہے۔ زبان کا یہ فرق گئودان کے ابتدائی ابواب اور آخری ابواب کے تقابلی مطالعہ سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے" غالباً وہ اس کے آخری حصص کو بالکل نہیں دیکھ سکے ہیں۔

۲۔ تاہم اردو گئودان میں پریم چند کی زبان کا کچھ حِصّہ قائم ہے۔ یہ حِصّہ دیہاتی مکالمات میں ہے جو مترجم نے جوں کے توں رہنے دیئے ہیں۔ لیکن اس میں جہاں قلم لگایا ٹیڑھا لگا ہے۔ مثلاً:۔

گئودان:۔ دھنیا نے کہا برادری میں سُرکھ رو کیسے ہوتے۔

گئودان:۔ دھنیا نے کہا برادری میں اُجاگر کیسے ہوتے۔

(ص ۱۹۹، س ٦)

چہ بوالعجبی است! ہندی میں سُرکھ رو (سُرخ رو) اور اردو میں اُجاگر!

دیہاتی مکالمے ترجمہ نہیں نقل لفظ ہیں۔ لیکن ۳٦ ابواب کے

مشتمل ۵۸۹ صفحات کی اس ناول کا یہ دس فیصد حصّہ بھی نہیں، شہری کرداروں کے مکالمے اور مصنف کی اپنی عبارت سب کی سب ترجمہ کی گئی ہے، اور اس کی تمام تر ذمہ داری اقبال ورما سحر پر عاید ہوتی ہے۔

ایسی صورت میں اُردو میں گئودان پریم چند کی اصل تصنیف نہیں بلکہ ان کے ہندی ناول کا ترجمہ ہے۔ جسے ایک دوسرے شخص نے کیا ہے۔ گئودان کا اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں، اس کو محض ترجمہ کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ اس لیے گئودان کو اُردو کا ناول یا بہترین ناول نہیں قرار دیا جاسکتا۔

تمّت

مصنّف کی دیگر تصانیف

۱۔ جدید عربی ادب کا ارتقاء

صفحات : ۱۶۸

قیمت : -/۳

۲۔ عربی شاعری کے بنیادی رجحانات

قیمت : -/۳

۳۔ تنقید کے اصول اور نظریات

صفحات ۳۵۲

قیمت مجلد : ۷/۰

بلا جلد : ۶/۰

مصنّف کی دیگر زیرِ طبع کتابیں

۱۔ عربی تنقید کا ارتقا

۲۔ جدید عربی شاعری کا ارتقا

۳۔ تاریخ مصلحین اُمّت دَورِ جدید

۴۔ سُنّت کی روشنی یا ضیاء السُّنّۃ

مصنّف کی کتابیں ملنے کے پتے

۱۔ ڈاکٹر مسعود الحسن قدوائی کتھولینڈری
ضلع رائے بریلی۔ یو۔ پی۔

۲۔ دانش محل بک سیلرز امین الدولہ پارک
لکھنؤ۔ یو۔ پی

۳۔ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔
پروفیسر وصدر شعبہ اردو، عربی، فارسی
کالی کٹ یونیورسٹی
(کیرالا)